شہرود

آخری مجموعۂ کلام

اختر شیرانی

آئینۂ ادب چوک مینار انارکلی لاہور

بار دوم

۱۹۶۵ء

قیمت : ا روپیہ ۷۵ پیسے

اہتمام :-

م، ع، سلام آئینۂ ادب چوک مینار

انار کلی۔ لاہور

(اشرف پریس لاہور)

چہرہ نما

مئے کہ می رود امروز در گلوئے دو کون

کمینہ جرعہ تہِ شیشہائے دوش من است

فہرس

نعتیں

منظومات

غزلیات

سانیٹ:

فکاہات

ماہیے

سوزِ ناتمام

مقدمہ

از نیرؔ واسطی

اختر شیرانی ۴ مئی ۱۹۰۵ء مطابق ۲۸ ربیع الاول ۱۳۲۳ھ کو اپنے آبائی وطن ریاست ٹونک میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم مبارک حافظ محمود خاں شیرانی ہے۔ اور افغانوں کے مشہور اور ممتاز خاندان شیرانی سے نسبت کی وجہ سے آپ کو شیرانی کہا جاتا ہے۔ آپ کا اصل نام والد نے محمد داؤد خاں رکھا تھا۔ اور گھر والے بالعموم آپ کو اسی نام سے یاد کرتے تھے۔ مسعود خسرو آپ کا تاریخی نام تھا۔ اور بعد میں آپ نے

اپنا تخلص اختر اختیار کیا اور اب وہ دنیائے ادب میں اسی نام سے مشہور اور متعارف ہیں۔

آپ نے قرآن کی ابتدائی تعلیم اپنے وطن ٹونک میں اپنے ایک پرانے اتالیق حافظ منور خاں صاحب سے حاصل کی۔ بعد میں اردو کی ابتدائی کتابیں اپنی چچی سے پڑھیں اور پھر فارسی کی کچھ ابتدائی تعلیم آپ نے اپنے گھر پر مولوی احمد زمان صاحب سے حاصل کی اور بعد میں مولوی صابر علی صاحب شاکر سے استفادہ کیا۔ اور درحقیقت شاعری کا ذوق ابتدائً آپ کو شاکر صاحب کے تلمذ ہی کی بدولت پیدا ہوا۔

حافظ محمود خاں صاحب شیرانی ۱۹۱۴ء میں جب انگلستان سے ٹونک واپس آئے تو انھوں نے آپ کی ذہنی تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ کی جسمانی تربیت کی طرف بھی توجہ فرمائی۔ اور اس مقصد کے لیے ٹونک میں ایک پہلوان قیوم خاں کو آپ کو ورزش کرانے اور کشتی سکھلانے کے لیے ملازم رکھا۔ اور خوش نویسی کی تعلیم کے لیے ایک علیحدہ استاد مقرر کیا۔

۱۹۲۰ء کے بعد آپ کے والد ٹونک سے جلا وطنی کے سلسلہ میں لاہور چلے آئے اور یہاں آکر انھوں نے اپنے محترم استاد محمد دین مختار

پروفیسر فارسی اورینٹیل کالج لاہور کی خدمت میں آپ کو پیش کیا۔ اختر نے اورینٹیل کالج میں داخل ہو کر اپنی خداداد ذہانت کے وہ جوہر دکھائے کہ آپ کے اساتذہ ششدر و حیراں تھے۔ وہاں آپ نے غالباً ۱۹۲۲ء میں اعلیٰ نمبروں میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ لیکن اس کے بعد آپ کے ادبی رجحانات اور ماحول نے آپ کو مزید تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں دیا۔

آپ کا میلانِ طبع اب پوری قوت کے ساتھ آپ کو شاعری کے میدان میں لے آیا اور یہاں آپ نے ابتداءً علامہ تاجور نجیب آبادی سے اصلاح لی اور بعد میں اپنی طبع خداداد ہی کو اپنا اُستاد بنا لیا۔

پہلے کچھ مدت تک آپ نے رسالہ "ہمایوں" کی ادارت کا کام کیا۔ اس کے بعد ۱۹۲۵ء میں رسالہ انتخاب کی ادارت کی۔ پھر ۱۹۲۸ء میں خیالستان نکالا جو بعد میں بند ہو گیا۔ اور اس کے بعد ۱۹۳۱ء میں چند سالوں کے لیے رومان جاری کیا اور پھر کچھ مدت کے لیے شاہکار کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔

ان رسالوں کے علاوہ آپ نے مجمع البحرین، مطلع السعدین اور جامع اللغات کی ترتیب و تدوین میں بڑا حصہ لیا۔ اور عوفی کی جوامع الحکایات کا دو جلدوں میں ترجمہ اور خلاصہ لکھا۔ علاوہ ازیں آپ نے اپنی متعدد تالیفات مثلاً نثر میں اخگاک، آئینہ خانے میں، اور دو ترکے، دل کی اور

نظم میں پھولوں کے گیت۔ نغمۂ حرم، صبح بہار۔ اختر ستان۔ لالۂ طور۔ طیورِ آوارہ۔ شہناز اور شعرستان بطور یادگار چھوڑیں۔

۱۹۳۵ء میں اختر کو دارالترجمہ حیدرآباد دکن میں ایک معزز عہدہ پیش کیا گیا۔ لیکن آپ نے وہاں جانے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اختر ایک بے نیاز اور آزاد منش انسان تھے اور وہ کسی قسم کی پابندی اپنے ذمے لینا نہیں چاہتے تھے۔ اسی طرح جب آپ کے والد اسلامیہ کالج لاہور کی پروفیسری چھوڑ کر اورینٹل کالج لاہور میں تشریف لے گئے تو آپ سے کہا گیا کہ اسلامیہ کالج لاہور میں اپنے والد کی جگہ قبول کر لیں لیکن آپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ لڑکوں کا پڑھانا میرے بس کا روگ نہیں

۱۹۳۴ء میں اختر کی شاعری کے شباب کا زمانہ تھا۔ اور چونکہ وہ شاعر شباب در رومان تھے۔ اس لیے یہاں کالجوں کی دنیا میں خصوصیت سے آپ کے نام کی دھوم مچی ہوئی تھی۔

فلیمنگ روڈ لاہور پر آپ کے والد کے مکان میں زینے کے پاس ایک چھوٹا سا کمرہ آپ کے لیے مخصوص تھا۔ جس میں کچھ کتابیں ایک میز، چند کرسیاں اور ایک چارپائی دیکھی جاتی تھی۔ یہ مختصر سا کمرہ درحقیقت ایک بہت بڑا مدرسۂ شعر و ادب تھا۔ جہاں اختر نے دنیائے ادب و انشا میں

ایک نئے طرز اور اسلوب کی بنیاد رکھی - اور جہاں بیٹھ کر اس وقت کے بے شمار ادیبوں نے آپ سے مذاکرات کے سلسلے میں بے شمار ادبی مسائل حل کیے اور فنِ شعر کے ہزاروں اسالیب سیکھے - پس آج جو یہاں اس نئے گلشنِ علم و ادب میں یہ بہار تازہ آ رہی ہے حقیقت یہ ہے کہ اس میں اس "اختر ستان" کے فیض و کرم کا بہت بڑا حصہ ہے -

المختصر یہ کہ ۱۹۴۳ء تک لاہور کے فلیمنگ روڈ کے ایک گوشے میں یہ سلسلۂ فیوض جاری رہا - تاآنکہ اختر اس کے بعد اپنے والد کے ساتھ ٹونک تشریف لے گئے - وہاں وہ کئی سال تک رہے اور پھر مرنے سے تقریباً چھ ماہ پہلے لاہور آ کر میرے غربت کدے پہ مقیم ہوئے اور بالآخر ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا - اور اپنے محبوب شہر سلمیٰ "لاہور" میں خاک میانی شریف میں دفن ہوئے - ع

پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا

اختر نے اپنے بعد ایک بیوہ، دو یتیم بچے - ایک یتیم بچی اور چالیس دن کی ایک لڑکی کو چھوڑا - اس غریب الدیار شاعر کے خاندان کا یہ قافلہ اس کے آخری ایام حیات میں ٹونک سے چلا اور اب یہ سلسلۂ مہاجرت اس کی والدہ سمیت لاڑکانہ (سندھ) میں مقیم ہے -

اختر شیرانی مرحوم کی عام زندگی کے یہ مختصر حالات ہیں۔ اُن کی اصل زندگی وہ حیات معاشقہ ہے جو سلمیٰ کے عشق کے ساتھ شروع ہوئی اور ان کی موت پر ختم ہو گئی۔ اور یہی وہ زندگی ہے جو ان کے تقریباً تمام کلام کے پس منظر کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں نے ان کی زندگی کی یہ دلچسپ داستان "اخترِ و سلمیٰ" کے عنوان سے علیحدہ لکھ لی ہے جو عنقریب نذرِ قارئین اختر ہو گی۔ یہاں تو یہ چند سطریں ان کی عام زندگی سے متعلق بطور یادداشت عرضِ خدمت ہیں یعنی ع

کچھ ابھی دل کی لگی ہم نے اختصار کھی ہے

لاہور نیر منزل

۱۰ جولائی ۱۹۴۹ء

کچھ شہر ودکے متعلق

یہ شہرود اختر مرحوم کی آٹھویں منظوم تصنیف ہے جو اب ان کے بعد شائع کی جارہی ہے۔

یہ کتاب درحقیقت اُن کی ان نظموں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے مرنے سے قبل میرے مکان پر قیام کے زمانے میں لکھیں۔ لیکن بعد میں، میں نے احباب کے مشورے سے اس میں ان کی چند وہ نظمیں بھی شامل کردی ہیں جو اس سے پہلے ان کے کسی مجموعے میں شائع نہیں ہوئیں۔ اور ہمیں اب ان کے بعض دوستوں اور اخبارات اور رسالوں سے دستیاب ہوتی ہیں۔ کیونکہ خیال یہ ہوا کہ ان قدیم نظموں کو بھی اس وقت اسی مجموعے میں شامل کرکے شائع کردیا جائے تاکہ یہ چیزیں دستبردِ حوادثِ زمانہ سے محفوظ ہوجائیں۔

ہمارا ارادہ ہے کہ اب شہرود اور اختر کے تمام مجموعہ ہائے نظم و نثر کو آئینۂ ادب کے اہتمام سے نئے

حسنِ ترتیب اور اضافہ کے ساتھ ملک میں پیش کیا جائے۔

رود فارسی زبان میں ایک ساز کہتے ہیں حافظ نے اپنے کلام میں اس رود کا ذکر اس طرح کیا ہے ؎

بنوش جام صبوحی بنالۂ دف و چنگ
ببوس غبغب ساقی بہ نغمۂ نے و رود

مشہور شاعر اور ماہر موسیقی رودکی کو 'رودکی' غالباً اسی نسبت سے کہا جاتا ہے کہ وہ رود بجانے میں یدِطولیٰ رکھتا تھا یہاں شہرود سے مراد تمثیلاً یہی بہترین قسم کا رود ہے۔ جس کے ذریعے اختر نے دنیا میں آخری بار اپنے پُر بہار نغمے پیش کیے ہیں۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا شہرود ان کے کلام کا آخری مجموعہ ہے اور اس میں درد و الم اور سوز و گداز کی ایک خاص چاشنی کے علاوہ بعض اہم خصوصیات ہیں، مثلاً:

(۱) اس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد میں وہ نعتیں ہیں جن میں اختر نے موت سے پہلے سرکار مدینہ کے حضور میں انتہائی

عقیدت کے ساتھ اپنے دل کے جذبات کو پیش کیا ہے۔

(۲) اس میں اختر کے دل کے وہ بے پناہ احساسات اور افکار ہیں جو مرنے سے پہلے ان کے دل و دماغ کی دنیا میں ہنگامہ برپا کیے ہوئے تھے۔ مثلاً چناروں کی چھاؤں میں مرنے کا شوق۔ بیوی بچّوں کی یاد اور سلمیٰ کے لیے آخری پیام رخصت دائمی وغیرہ

(۳) اس میں کلام کی وہ پختگی بدرجۂ اتم موجود ہے جو آخر عمر میں ہر شاعر میں پیدا ہوتی ہے اور اُن کے اس کلام میں خصوصیت سے بہت زیادہ نمایاں ہے۔

نیرّ واسطی

غزل

"سلمیٰ"

مرو کہ در غمِ ہجرِ تو از جہاں برویم　　بیا کہ پیشِ تو از خویش ہر زماں برویم

سخن بگوئے کہ پیشِ لبِ تو جاں بدہیم　　رہا مکن کہ دریں حسرت از جہاں برویم

روا مدار کہ جاں بر لب است و ما ز جہاں　　ندیدہ کامِ دل از آں لب و دہاں برویم

گدائے کوئے شما ایم و حاجتے داریم　　روا مدار کہ محروم از آستاں برویم

مگو کہ حافظ ازیں در برو برائے خدا

کہ ہر چہ رائے تو باشد جز ایں بر آں برویم

تقریب

کہو رضواں سے کیوں ہے اس قدر فردوس پر نازاں
ہزاروں جنتیں آباد ہیں تخئیلِ اختر میں

آغا حشر کاشمیری

نعتیں

نعت

(۱)

مسند نشینِ عالمِ امکاں تمہیں تو ہو!
اس انجمن کی شمعِ فروزاں تمہیں تو ہو!
دنیائے ہست و بود کی زینت تمہیں سے ہے
اس باغ کی بہار کے ساماں تمہیں تو ہو!
روشن ہے جس کی ضو سے شبستانِ زندگی
وہ ماہِ نیم ماہِ شبستاں تمہیں تو ہو!
دُنیا کی آرزو میں فنا آشنا ہیں سب
جو روحِ زندگی ہے وہ ارماں تمہیں تو ہو!
صبحِ ازل سے شامِ ابد تک ہے جس کا نور
وہ جلوہ زارِ حسنِ درخشاں تمہیں تو ہو!
تم کیا ملے کہ دولتِ ایماں ملی ہمیں
ایمان کی تو یہ ہے کہ ایماں تمہیں تو ہو!

دارائے چرخ و دورِ زمیں جس کے ہیں غلام
وہ نازِ دہر و نازشِ دوراں تمہیں تو ہو!

شادابیٔ صنوبر و نسریں تمہیں سے ہے
بوئے گل و بہارِ گلستاں تمہیں تو ہو!

دنیا و آخرت کا سہارا تمہاری ذات
دونوں جہاں کے والیٔ و سلطاں تمہیں تو ہو!

اختر کو بے نوائیٔ دنیا کا فکر کیا
سامان طرازِ بے سر و ساماں تمہیں تو ہو!

[illegible]

[illegible] فانی زندگانی میں
[illegible] جلوہ گاہِ زندگانی میں
[illegible]
[illegible]

نعت

سرکارِ مدینہ

(۲)

سودا ہے یہ سر میں

سرکارِ مدینہ! مختارِ مدینہ!

دیکھوں کبھی جا کر دربارِ مدینہ

یثرب کے نظارے! گلزارِ مدینہ

سرکارِ مدینہ!

بستی ہیں نظر میں!

وہ چاندنی راتیں شاداب کھجوریں!

یا شرم و حیا سے سمٹی ہوئی حوریں!

زلفوں کو سنوارے سرشارِ مدینہ!

سرکارِ مدینہ!

وحشت ہے نظر میں

اور غم کے اثر سے　　روئی ہوئی آنکھیں!
حسرت کی فضا میں　　کھوئی ہوئی آنکھیں
دل کیوں نہ پکارے　　دلدارِ مدینہ

سرکارِ مدینہ

ہے درد جگر میں

اور دل بھی ہے بسمل　　بے تاب ہے جاں بھی
آنکھوں میں ہیں آنسو　　اور لب پہ فغاں بھی
غم کے ہیں اشارے　　غمخوارِ مدینہ

سرکارِ مدینہ

یثرب کے نگر میں

بلواؤ خدارا　　تنگ آئے ہیں غم سے
روتے ہیں شب و روز　　فرقت کے ستم سے
ہم درد کے مارے　　بیمارِ مدینہ

سرکارِ مدینہ

نعت

(۳)

لٹائے سجدے نہ کیوں آسماں مدینے میں
رسولِ پاک کا ہے آستاں مدینے میں

قدم بڑھائے چلو رہروانِ منزلِ شوق
ہے ابرِ رحمتِ حق گلفشاں مدینے میں

درِ رسولؐ کے ذرّوں کی گر تلاش نہیں
تو کس کو ڈھونڈتی ہے کہکشاں مدینے میں

بہشت چیز ہی کیا ہے کہ ایک سجدے میں
ہمیں تو مل گئے دونوں جہاں مدینے میں

قدم اُٹھائے ادب سے ذرا نسیمِ سحر
ہیں محوِ خواب شہِ دو جہاں مدینے میں

مدینے جاتے ہیں پیری میں لوگ سب اخترؔ
مزا ہے کاٹ دو عمرِ جواں مدینے میں

نعت

(۴)

سحر دمِ رحمتِ حق کا یہ مستانہ پیام آیا
مبارک اہلِ ایماں کو کہ وہ خیر الانام آیا
خدائی جس کے جلووں سے ہمیشہ جگمگائے گی
شبستانِ حرا کا آج، وہ ماہِ تمام آیا
زمین و آسماں بھی جس کے در پر سر جھکا دینگے
ہیں چرچے قدسیوں میں آج وہ عالی مقام آیا
جبینِ بندگی بے تاب ہے سجدے لٹانے کو
الٰہی! تیرے بندوں کی زباں پر کس کا نام آیا
مرے دل میں ہزاروں طورِ سینا جگمگا اُٹھے
کچھ اس انداز سے دل میں ترا شوق تمام آیا
بشر تھا وہ مگر ایسا، جسے خیر البشر کہئے
غریبوں کی خبر لی اُس نے، بیماروں کے کام آیا

زباں چپ ہو گئی جب دل نے چھیڑا تذکرہ اُن کا
دلوں کو وجد آیا، جب زباں پہ اُن کا نام آیا
کئے جتنے داغ کثرت کے، دلوں سے دھل گئے سارے
لیے ہاتھوں میں ساقیٔ عرب، وحدت کا جام آیا
مزا جب ہے کہ جائیں خلد میں ہم اس طرح اختر
کہیں حوریں محمد کا وہ مستانہ غلام آیا

صد رنگی آزمائش

طلوع و نشر تھا مطلوب جب حسن کبریائی کو
کہاں تک ضبط کرتا دل میں بیتاب خود نمائی کو
دیا منشا نے جب بعثت نبوی کے منصب سے
خدا نے بن کے انساں آزمایا تھا خدائی کو

نعت

(۵)

لائی نسیم بادیۂ خوشبوئے گیسوئے نبیؐ
قربان گیسوئے نبیؐ، قربان خوشبوئے نبیؐ

ہم بے خودانِ عشق کا، دیر و حرم سے واسطہ
محرابِ بیتِ حق نما، ہے قوسِ ابروئے نبیؐ

گلہائے رنگینِ جہاں، رکھتے ہیں وقفِ اپنی آل
ہاں اے ہوائے گلفشاں، لے آ ذرا بوئے نبیؐ

دورِ زماں پردہ اٹھا، میں شوق سے ہو لوں ذرا
صدقے سراپائے نبیؐ، قرباں سرِ روئے نبیؐ

"میں بھی ہوں تم سا اک بشر" فرما چکے پھر بھی مگر
تو لے تو جا بادِ سحر، میری دعا سوئے نبیؐ

دنیائے آب و گِل کہاں اختر سکونِ دل کہاں
ہے تو سکونِ دل سے ہے آباد اک کوئے نبیؐ

نعت

(۶)

اگر اے نسیمِ سحر ترا ہو گذر، دیارِ حجاز میں
مری چشمِ تر کا سلام کہنا حضورِ بندہ نواز میں

تمہیں حدِ عقل نہ پا سکی، فقط اتنا حال بتا سکی
کہ تم ایک جلوۂ راز تھے جو عیاں ہُوا رنگِ مجاز میں

عجب اک سرور سا چھا گیا، مری روح و دل میں سما گیا
ترا نام ناز سے آ گیا، مرے لب پہ جب کبھی نماز میں

نہ جہاں میں راحتِ جاں ملی نہ متاعِ امن و اماں ملی
جو دوائے دردِ نہاں ملی، تو ملی بہشتِ حجاز میں

کروں نذر نغمۂ جاں فزا میں کہاں سے اخترؔ غم نوا
کہ سوائے نالۂ غم نہیں مرے دل کے غمزدہ ساز میں

منظومات

بہاریہ

دھوم ہے گلزارِ ہستی میں پھر آتی ہے بہار!
رنگ و بوئے خلد کا پیغام لاتی ہے بہار!
ابر گونجا باغ میں، دھومیں مچاتی ہے بہار!
رس بھرے نغموں کا طوفاں بنکے آتی ہے بہار!

غنچہ و گل کا حسیں ملبوس ہے زیبِ بدن
سر پہ رکھنے چاندنی کا تاج آتی ہے بہار!

چشمِ بد بیں کی نظر لگنے نہ پائے اس لیے
پردہ ہائے گل میں چھپ کر مسکراتی ہے بہار!

ہے خس و خار و خزاں کا خوف دل کو اس لیے
ہر کلی میں رنگ بن کر لہلہاتی ہے بہار!

زہرۂ و ماہ و ثریا جھومتے ہیں ناز سے
چاندنی راتوں میں جب نغمے سناتی ہے بہار!

میکشانِ رنگ و بُو کو ہو نہ کیوں بے خودی
جا بجا لے کر گُل بیلے ہاتھوں میں آتی ہے بہار!

ابر و برق و باد کے رنگیں اشارے الاماں
آ، سلمیٰ، باغ میں ہم کو بلاتی ہے بہار!

آہ یہ برکھا کی راتیں، ہائے یہ ساون کی رُت!
کیا سہانے سپنے آنکھوں کو دکھاتی ہے بہار!

بن کے بادل کی گرج، کیا جانے کس کی یاد میں
رات بھر اکثر "حبیبوں" کو جگاتی ہے بہار!

تارِ مضرابِ صبا پر سا رہا ہے میکدہ سے
شاخِ گُل کا بربطِ رنگیں بجاتی ہے بہار!

آہ اُس خورشید وش کی حسن آرائی کا پاس
آستانِ ناز پہ سجدے لٹاتی ہے بہار!

کس قدر شوقِ رسائی ہے کہ پائیں باغ میں
اُس کے بستر کے لیے کلیاں کھلاتی ہے بہار!

کس کے گوش و گردن و گیسو کی زینت کے لیے
رات بھر بیٹھی ہوئی گجرے بناتی ہے بہار!

آج وہ جانِ بہار آنے کو ہے شاید اِدھر
ورنہ یوں گلشن میں کیوں کلیاں بچھاتی ہے بہار

ہمدم، اس جانِ جہاں کی یاد میں بے اختیار
کیا کہیں کس کس طرح ہم کو رلاتی ہے بہار!

باغ میں جھولے پڑے ہیں جھولتے ہیں گلعذار
لب پہ ساون کے رسیلے گیت گاتی ہے بہار!

اک ادائے شرمگیں ہو کر شباب و حسن کی
مہ جبینوں کی نظر میں مسکراتی ہے بہار!

ایک مستانہ تبسم بن کے عیش و شوق کا
نازنینوں کے لبوں پر لہلہاتی ہے بہار!

ابر چھایا باغ پر، پڑنے لگی مینہ کی پھوار
نو عروسانِ چمن کا منہ دھلاتی ہے بہار!

ناصحِ ناداں کو سمجھا دے یہ کوئی اے ندیم
توبہ ہو جاتی ہے رخصت، جبکہ آتی ہے بہار!

جنبشِ بادِ سحر سے شاخِ گل ہے وجد میں
آبشارِ نغمہ و نکہت بہاتی ہے بہار!

مور گونجے کوئلیں کوکیں، پپیہے بول اُٹھے
کتنے کمسن مطرب اپنے ساتھ لاتی ہے بہار!
شاخسارِ لالہ و گُل کو ہلاتی ہے نسیم
نوجواں کلیوں کو یا جھولا جھلاتی ہے بہار!
نغمہ و رقص و مے و مینا کا موسم آگیا
قہقہۂ کیف و طرب کے پھول اُڑاتی ہے بہار!
زاہد ہے میری شکستِ توبہ پر کیوں طعنہ زن
دل پہ بس چلتا نہیں جس وقت آتی ہے بہار!
ہوش والوں کو بھی اس موسم میں کب ہے اپنا ہوش
خوابِ طفلی بن کے عالم کو ہنساتی ہے بہار!
دخترانِ غنچہ تھیں زیرِ نقابِ نامیہ
چہرہ ہائے ناز سے پردے اُٹھاتی ہے بہار!
چاندنی پھیلی ہوئی ہے وادی و گلزار پر
یا محیطِ نور و نکہت میں نہاتی ہے بہار!
وہ بہارِ گلستانِ دل منظر سے دُور ہے
اختر اس عالم میں کیوں ہم کو ستاتی ہے بہار!

یہ دُنیا!

یہ دنیا، جو الم آبادِ افکارِ محبّت ہے!
یہ دنیا جو تظلّم گاہِ جبرِ دستِ قدرت ہے!
یہ دُنیا جو ستم زارِ حیوانِ بربرّیت ہے!
یہ دنیا دیکھنے میں کس قدر معصوم جنّت ہے!

یہ دُنیا جس میں آنسو بہتے ہیں رنگیں نگاہوں کے
یہ دُنیا جس میں بادل گونجتے ہیں غم کی آہوں کے
نصیبِ اہلِ آدم کے لیے جو ایک لعنت ہے!
یہ دُنیا دیکھنے میں کس قدر معصوم جنّت ہے!

زبانِ عیش کہتی ہے بہشتِ بے خزاں جس کو
نگاہِ بیکسی سے دیکھتی ہے کہکشاں جس کو

مگر سینے میں جس کے داغِ خونِ عہدِ لطافت ہے
یہ دُنیا دیکھنے میں کس قدر معصوم جنّت ہے!

ہزاروں محفلیں آباد ہیں جس میں گناہوں کی
غمونکی، حسرتونکی، رنج کی، اشکوں کی، آہونکی
جہاں ہر وقت برپا اِک نہ اِک تازہ قیامت ہے
یہ دُنیا دیکھنے میں کس قدر معصوم جنّت ہے!

جسے کہتے ہیں ہم گہوارہ جنّت کی بہاروں کا
جو رمنا ہے ستاروں، سبزہ زاروں جوئباروں کا
حقیقت میں مگر یہ مقتلِ حسن و صداقت ہے!
یہ دُنیا دیکھنے میں کس قدر معصوم جنّت ہے!

جہاں مصروفِ ماتم ہیں اُمیدیں نا اُمیدوں کی
جہاں اشکوں سے لکھی جاتی ہے سرخی نویدوں کی
جہاں ہر تازہ عشرت، اک ابد گاہِ مصیبت ہے

یہ دنیا دیکھنے میں کس قدر معصوم جنت ہے!

تمنائیں تڑپتی ہیں جہاں معصوم روحوں کی
مرادیں تلملاتی ہیں جہاں مغموم ذہنوں کی
جہاں ہر سمت آفت ہے، مصیبت ہے، اذیت ہے
یہ دنیا دیکھنے میں کس قدر معصوم جنت ہے!

جہاں کا ذرہ ذرہ درس خونخواری سکھاتا ہے
جہاں حیراں ہے یزداں اور شیطاں مسکراتا ہے
جہاں حیوانیت سرِ وقفِ سرورِ بغاوت ہے
یہ دنیا دیکھنے میں کس قدر معصوم جنت ہے!

جہاں سینوں میں رنج و غم سے اکثر دل دھڑکتے ہیں
جہاں سوزِ نہاں سے جذبہ ہائے غم بھڑکتے ہیں
جو اک پروردگارِ شعلۂ عشق و محبت ہے!
یہ دنیا دیکھنے میں کس قدر معصوم جنت ہے!

جہاں پنہاں ہیں مارِ آستیں سینہ شاخوں کے دامن میں
جہاں خونخوار کانٹے ہیں نہاں پھولوں کی چلمن میں
جہاں باطل کے پردے میں چھپا روئے حقیقت ہے
یہ دنیا دیکھنے میں کس قدر معصوم جنت ہے!

یہ دُنیا رشک کرتا ہے سوادِ آسماں جس پر
حسد سے ڈالتی ہے اپنی نظریں کہکشاں جس پر
ہمارے دیدۂ تیرہ میں جو اک خوابِ ظلمت ہے
یہ دنیا دیکھنے میں کس قدر معصوم جنت ہے!

جہاں پڑھتا رہا ہوں مرثیے میں شادمانی کے
جہاں لکھے ہیں نوحے میں نے اپنی نوجوانی کے
جہاں میرے لیے ہر سانس اک پیغامِ رحمت ہے
یہ دنیا دیکھنے میں کس قدر معصوم جنت ہے!

ساقی سے!

اٹھا ساغر کہ دنیا درپئے آزار ہے، ساقی!

زمانہ ہو کہ قسمت برسرِ پیکار ہے، ساقی!

پلا دے آج تو جتنی مئے گلنار ہے، ساقی!

کہ پھر ابرِ جواں رقصاں سرِ کہسار ہے، ساقی!

غضب ہے، یہ جوانی اور ہم اس طرح سے کاٹیں

کہ اک اک سانس اک چلتی ہوئی تلوار ہے، ساقی!

زمانے کی طرح رنگت بدلنا کس سے سیکھا ہے

کبھی اقرار ہے ساقی، کبھی انکار ہے، ساقی!

پلا دے آج تو جتنی پلائی جا سکے مجھ کو!

ہمائے عمر اڑنے کے لیے تیار ہے، ساقی!

مجھے ذوقِ بلا نوشی نے یہ کیسی سزا دی ہے؟

اِدھر پیرِ مغاں برہم، اُدھر بیزار ہے، ساقی!

یہ تیرے سبز پیراہن نے کیسے گُل کھلائے ہیں؟
کہ میخانے کا میخانہ گُل و گلزار ہے، ساقی!
پلا دے جتنی چاہے اپنو مہماں ہیں کوئی دم کے
جرس کا شور گونجا، کارواں تیار ہے، ساقی!
زمین و آسماں سرشار و بیخود ہوں تو حیرت کیوں
اِدھر میخانہ بیخود ہے، اُدھر سرشار ہے، ساقی!
گھٹائیں ہیں کہ خاکی پوش پریاں مسکراتی ہیں
اٹھا ساغر کہ دنیا حُسن سے سرشار ہے، ساقی!
خمارِ شب کو رنگیں کر دیے گُلہائے صبوحی سے
نسیمِ صبح جاگی، ابر بھی گُلبار ہے، ساقی!
زمانے کے غموں نے یہ سبق ہم کو سکھایا ہے
جو بیخود ہے یہاں ساقی، وہی ہشیار ہے، ساقی!
غنیمت جان اس صحبت کو پھر ایسی کہاں صحبت؟
کہ جو منظر ہے ہستی کا فنا آثار ہے، ساقی!
ترے میخانے پہ قربان کر دی دولتِ ہستی
اور اس پر بھی گلہ، میری وفا نادار ہے، ساقی!

چمن بیخود، دمن بیخود، فضا بیخود، ہوا بیخود
افق سرمست ہے، ابرِ رواں سرشار ہے ساقی!

نسیمِ شام، دل کے ولولوں کو گدگداتی ہے
خدائی کیفیت و رقص و وجد سے سرشار ہے ساقی!

یہ بادل ہیں کہ ہیں رنگیں پریشاں بیخود و رقصاں
عجب حشرِ حسیں برپا سرِ کہسار ہے ساقی!

پریشاں تو بھی کردے زلفِ مشکیں دوشِ نازک پر
کہ صحنِ باغ میں اودی گھٹا گلکار ہے ساقی!

نہ دے فرصت، کہ مجھ کو ہوش آئے اپنے زخمِ دل کا
کہ دنیا یکسر اک اہرمنِ خونخوار ہے، ساقی!

ادب سے ماہِ نو، مرمر کی کشتی لے کر آیا ہے
تری جھوٹی فرشتوں کے لیے درکار ہے ساقی!

خریدی جا نہیں سکتی خوشی دنیائے غمگیں میں
مگر تیرے کرم سے یہ بھی کیا دشوار ہے ساقی!

دلِ غمگیں کو بہلانے کی خاطر در پہ آتے ہیں
محبت ہے کہ جیتے جی کا اک آزار ہے ساقی!

اُٹھا تو شانۂ صہبا کو خوابستانِ مینا سے
بہارِ صبح جاگ اُٹھی، چمن بیدار ہے ساقی!

غموں کے ہاتھ سے مر مر کے جینا کیا قیامت ہے
خوشی کا جام لائے، زندگی دشوار ہے، ساقی!

دماغ و دل میں بال افشاں کچھ اس صورت سے رہتا ہے
چھلکتا جام گویا طائرِ افکار ہے، ساقی!

خدائی ہے کہ ہے اک بزمِ گلباری و گلکاری
اِدھر گلبار ہے بدلی، اُدھر گلکار ہے، ساقی!

محبت کر، غمِ دنیا ستائے تو محبت کر!
محبت اس جہاں میں اک حسیں آزار ہے، ساقی!

محبت میں مزے لے لے کے مرنا تو مقدّر ہے
مگر اس کے لیے کچھ زندگی درکار ہے، ساقی!

عجب کیا ہے مری کی رات آنکھوں ہی میں کٹ جائے
اِدھر بیخواب ہے اختر، اُدھر بیدار ہے ساقی!

چناروں کی چھاؤں میں

کشمیر کی حسین بہاروں کی چھاؤں میں
شمشاد و سرو و گُل کی قطاروں کی چھاؤں میں
شاخ و شجر کے زمزمہ زاروں کی چھاؤں میں
بدلی سے جھانکتے ہوئے تاروں کی چھاؤں میں
آ مر رہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

امید وصل، ایک فریبِ خیال ہے!
یہ دل نشیں خلش، خلش بے مآل ہے!
اس زندگی میں ساتھ رہیں ہم محال ہے!
سفّاک، کینہ ساز ستاروں کی چھاؤں میں
آ مر رہیں، حسین چناروں کی چھاؤں میں

چھایا ہوا ہے ابر، ہوا خوشگوار ہے
موسم ہے، بے خودی ہے، چمن ہے بہار ہے

اک آخری خوشی کا فقط انتظار ہے
سرِ رہِ گُل و سمن کے نظاروں کی چھاؤں ہیں!

آ مر رہیں، حسین چناروں کی چھاؤں ہیں

اچھے بُرے زمانے کا اب انتظار کیا
ہم غم زدوں کے حق میں خزاں کیا بہار کیا!
ہاں اعتبار ہستئ بے اعتبار کیا
امید خس ہے غم کے شراروں کی چھاؤں ہیں

آ مر رہیں، حسین چناروں کی چھاؤں ہیں

کہتے ہیں پُرسکوں ہے بہت محفلِ عدم
آزادیٔ کشاکشِ غم، حاصلِ عدم
آ چل پڑیں جہاں سے سوئے منزلِ عدم!
اس کہکشاں کے راہ گزاروں کی چھاؤں ہیں

آ مر رہیں، حسین چناروں کی چھاؤں ہیں

آ جا کہ بعدِ مرگ تو آرام مل سکے
تسکین دردِ خاطرِ ناکام مل سکے
درمان جور گردشِ ایام مل سکے

اس رس بھرے افق کے کناروں کی چھاؤں میں
آ مر رہیں، حسین چناروں کی چھاؤں میں

اس خاکداں سے دُور ہے اک خاکداں نیا
دُنیا نئی، زمین نئی، آسمان نیا
چھوڑ اس جہاں کو چل کے بسائیں جہاں نیا!
پروین و مشتری کے دیاروں کی چھاؤں میں
آ مر رہیں، حسین چناروں کی چھاؤں میں

زہرِ آبۂ فراق کا پینا نہیں قبول
تیرے بغیر بادہ و مینا نہیں قبول
دُوری کے غم سے جھیل کے جینا نہیں قبول
مرنا قبول ہم کو بہاروں کی چھاؤں میں
آ مر رہیں، حسین چناروں کی چھاؤں میں

ننھا مہمان

ہمارے گھر میں نو بہارِ زندگی لایا ہے تو!
میرے ننھے مہماں کس دیس سے آیا ہے تو؟
کس بہشتِ حسن میں اب تک تھا کاشانہ ترا؟
میرے اجڑے باغ میں کیوں کر ہوا آنا ترا؟
کس زباں میں چپکے چپکے گفتگو کرتا ہے تو؟
کون جانے کس طرح کی ہاؤ ہو کرتا ہے تو؟
منزلِ ہستی سے پہلے کون سی منزل میں تھا؟
آج تک اے شمعِ محفل، کہہ تو کس محفل میں تھا؟
اے گلِ معصوم! اب تک تیرا گلشن تھا کہاں؟
طائرِ قدسی ادا، تیرا نشیمن تھا کہاں؟
آرزو بن کر کسی سینے میں تو خنداں رہا!
نکہتِ گل تھا، نقابِ غنچہ میں پنہاں رہا

میری بیوی کی تیرے رخسار میں نکہت ہے کیوں؟
اجنبی مہمان ہو کر اس کا ہم صورت ہے کیوں؟
انجمنستانِ لطافت کا تو زندہ خواب ہے!
یا سپہرِ حسن کا سیارۂ شاداب ہے؟
تو وہ جذبہ ہے جو دل سے چھن گیا اور یاس ہے؟
گم شدہ ارماں کا جیتا جاگتا احساس ہے!
دو دلوں کی التجا تجسیم ہو کر آگئی
دو نگاہوں کی بھی تصویر ہو کر آگئی
گرچہ پاسِ میہمانی و مروّت ہے مجھے
اجنبی مہمان، لیکن اک شکایت ہے مجھے
تو نے آ کر میری بیوی کی محبت چھین لی!
اس کا دل چھینا مرے دل کی مسرت چھین لی!
میرے گھر میں میہماں ہو کر تو رہزن بن گیا!
اس کا عاشق، ہو گیا اور میرا دشمن بن گیا!
اب وہ پہلے کی طرح مجھ پر فدا ہوتی نہیں
مجھ سے رہتی ہے جدا، تجھ سے جدا ہوتی نہیں

اُف! یہ کیسا انقلابِ آسمانی ہو گیا!
اس کا میرے پاس آنا اک کہانی ہو گیا!
چشمِ ظاہر کو نظر آتا ہے طفلِ سادہ تو!
کس طرح میری رقابت پہ ہوا آمادہ تو؟
عشق کا پہلا سا اب اظہار وہ کرتی نہیں
مجھ سے پہلے کی طرح اب پیار وہ کرتی نہیں
تیرا آنا تھا کہ اُس نے بے وفائی سیکھ لی
ایک گھر میں رہ کے بھی مجھ سے جدائی سیکھ لی
تیرے عشقِ سحر زا میں مُبتلا رہنے لگی
ساتھ رہ کر بھی مرے مجھ سے جدا رہنے لگی
میرا بستر تھا جو اک دن تیرا بستر ہو گیا
جو مقدّر تھا مرا، تیرا مقدّر ہو گیا
تو نے آ کر غاصبانہ قبضہ گھر پہ کر لیا
گھر پہ قبضہ کیا کیا ہر دل مسخّر کر لیا
نوکروں کو بھی نہیں ہے میری راحت کا خیال
سب کے دل میں موجزن ہے تیری خدمت کا خیال

تو نے آتے ہی بہارِ زندگانی لوٹ لی!
میری طفلی چھین لی، میری جوانی لوٹ لی!
اپنی ہستی کا خیال اور پاس اب باقی نہیں!
"میں بھی کچھ ہوں" تھا جو اک احساس اب باقی نہیں
عہدِ پیری آچلا فصلِ جوانی ختم ہے!
میرے رومانوں کی رنگیں داستانی ختم ہے!

نوید

سیاہیِ شبِ غم، منہ چھپانے والی ہے
بہارِ صبحِ طرب، لہلہانے والی ہے
نسیم، مژدۂ راحت سنانے والی ہے
نہ رو نہ رو کہ خوشی مسکرانے والی ہے!

غم و الم کے سمندر، سمٹنے والے ہیں
ہراس و یاس کے طوفاں مٹنے والے ہیں
سحر امید کی جلوے دکھانے والی ہے
نہ رو نہ رو کہ خوشی مسکرانے والی ہے!

نسیم جھوم کے مستانہ وار آتی ہے!
خبر ہے، باغ میں فصلِ بہار آتی ہے!
شگفتگی سی فضا میں سمانے والی ہے!
نہ رو نہ رو کہ خوشی مسکرانے والی ہے!

نظامِ عہدِ کہن ٹوٹ جائے گا اک دن
نیا زمانہ بہاریں دکھائے گا اک دن
سعادتوں کی بشارت پھر آنے والی ہے
نہ رو نہ رو کہ خوشی مسکرانے والی ہے!

زمانہ گو ہے دلآزار، دل فگار نہ ہو
سکوں سے کام لے، غمگین و بیقرار نہ ہو
بہار، غنچۂ خاطر کھلانے والی ہے!
نہ رو نہ رو کہ خوشی مسکرانے والی ہے!

ہجومِ غم سے عبث زار زار رونا ہے!
خوشی کبھی ہوتی ہے دُنیا میں غم کبھی ہوتا ہے!
ٹھہر، کہ شمعِ طرب جگمگانے والی ہے
نہ رو نہ رو کہ خوشی مسکرانے والی ہے!

چمن میں آتی ہے صبحِ بہار جام لیے
شرابِ شعلہ رُخ و حُسنِ لالہ فام لیے
گھٹا سرور کی عالم پہ چھانے والی ہے
نہ رو نہ رو کہ خوشی مسکرانے والی ہے!

بنے گا میکدۂ عیش الم کدہ دل کا!
نوائے شوق سے گونجے گا غمکدہ دل کا!
نسیمِ نغمۂ اُمید گانے والی ہے
نہ رو، نہ رو کہ خوشی مُسکرانے والی ہے!

غموں کا زہر اگر وقت لے کر آتا ہے
خوشی کا بادۂ گلنار بھی پلاتا ہے
فضا کو حورِ طرب پھر ہنسانے والی ہے
نہ رو، نہ رو کہ خوشی مُسکرانے والی ہے

اگرچہ راہ کٹھن ہے قدم بڑھائے چل
خدا کے آسرے سے آس تو لگائے چل
نہ ہار حوصلہ منزل بھی آنے والی ہے!
نہ رو، نہ رو کہ خوشی مُسکرانے والی ہے!

آثارِ سحر

آثارِ سحر ہوئے نمایاں
انوارِ سحر ہوئے نمایاں

بڑھنے لگی روشنی سحر کی
کملانے لگی ضیا قمر کی

مہتاب کا نور گھٹ رہا ہے
پردہ سا فضا سے ہٹ رہا ہے

آثارِ سحر نکھر رہے ہیں
دُھندلے ستارے اُکھڑ رہے ہیں

گلشن میں نسیم چل رہی ہے
ہر سُو خوشبو اُبل رہی ہے

مشرق میں عروسِ نور جاگی
آہنگ و ضیاء کی حور جاگی

آفاق کا رنگ مرمریں ہے
مابدوش افق کا گوہریں ہے
پیمانے افق میں نور بھر کر
لایا کوئی ساقیٔ فسونگر
مشرق کا افق جھلک رہا ہے
پیام سپہر چھلک رہا ہے
رنگت پھر آسماں کی چمکی
قسمت سارے کی جہاں کی چمکی
جاگ اٹھے ہیں طائران گلشن
آباد ہوا جہانِ گلشن!
شہ نوں نے ملہار اپنا چھیڑا
بھینگر نے ملہار اپنا چھیڑا
کچھ دل کو صبا نے گدگدایا

کرنوں کا گیت

ہم بستے ہیں تاروں میں   جنّت کی بہاروں میں
شاداب ستاروں میں   شفّاف نظاروں میں

ہم بستے ہیں تاروں میں

ہم حوریں ہیں تاروں کی   پریاں ہیں نظاروں کی
کرنیں ہیں ستاروں کی   رہتے ہیں ستاروں میں

ہم بستے ہیں تاروں میں

ہم نقش جوانی ہیں   موجوں کی روانی ہیں
رقصندہ کہانی ہیں   دریا کے کناروں میں

ہم بستے ہیں تاروں میں

ہم کھیلتے ہیں بن میں   کہسار کے دامن میں
ہم کھلتے ہیں گلشن میں   ہنستے ہیں بہاروں میں

ہم بستے ہیں تاروں میں

ہم بن کے ضیا برسیں   ہمراہ صبا برسیں
با نازو ادا برسیں   دنیا کے نظاروں میں
ہم بستے ہیں تاروں میں

ہم نور کے پارے ہیں   سب کھیل ہمارے ہیں
روشن جو نظارے ہیں   تاریک دیاروں میں
ہم بستے ہیں تاروں میں

گل ہیں کہ ضیا بار ہیں   ہم سے ہی درخشاں ہیں
ہم بزم چراغاں ہیں   باغوں میں بہاروں میں
ہم بستے ہیں تاروں میں

ایک عزیزہ کی شادی پر

نویدِ رحمتِ پروردگار بن کے رہو
برنگِ سایۂ نخلِ چنار بن کے رہو
تم اپنے گھر کے چمن میں بہار بن کے رہو!

بہشتِ نو کی فضائیں تمہیں مبارک ہوں
مسرتوں کی گھٹائیں تمہیں مبارک ہوں
نسیمِ گُل کی طرح مشکبار بن کے رہو!

زمانے بھر کی خوشی ہو تمہاری قسمت میں!
ہمیشہ عمر گزارو، سوادِ راحت میں!
تبسمِ چمنِ روزگار بن کے رہو!

مثالِ شمع، تم اس خانۂ انجمن میں رہو
برنگِ غنچہ و گل، شاد اس چمن میں رہو
تمہارا گھر ہو چمن، تم بہار بن کے رہو!

نئے عزیز ہوں مسرور و شادماں تم سے
نظر فروز بنے بزمِ خانداں تم سے
فروغِ دیدۂ لیل و نہار بن کے رہو!

ستانے پائیں نہ افکار، اس جہاں کے تمہیں
کریں ملول نہ آزار آسماں کے تمہیں
نزیلِ سایۂ پروردگار بن کے رہو!

سرورِ دیدۂ قسمت کہے تمہیں دنیا
غرورِ عصمت و عفت کہے تمہیں دنیا
جہاں میں عصمت و عفت مدار بن کے رہو!

سعادتیں ہوں میسر جہانِ نو میں تمہیں
نصیب برکتیں ہوں گلستانِ نو میں تمہیں
برنگ دامنِ ابرِ بہار بن کے رہو!

تمہاری خوبیٔ قسمت کی انتہا ہو نہ کچھ!
عروج و عظمت و دولت کی انتہا ہو نہ کچھ!
حریفِ سطحِ یمِ بے کنار بن کے رہو!

بہارِ چشمِ زمانہ ہنوز زمانے میں!

مسرتوں کا خزانہ بنو زمانے میں
طراوتِ گہرِ آبدار بن کے رہو!
مثالِ طائرِ پر دیں رہو جہاں بھی رہو
برنگِ غنچہ نسریں رہو، جہاں بھی رہو
حریفِ خندۂ فصلِ بہار بن کے رہو!
دعا ہے سب کی کہ آزاد و بامراد رہو!
دلوں کو شاد رکھو، خود ہمیشہ شاد رہو!
قرارِ جان و دلِ بے قرار بن کے رہو!

رخصتِ دائمی

قرار چھین لیا بے قرار چھوڑ گئے
بہار لے گئے، یادِ بہار چھوڑ گئے

ہماری چشمِ حزیں کا خیال کچھ نہ کیا
وہ عمر بھر کے لیے اشکبار چھوڑ گئے

جسے سمجھتے تھے اپنا وہ اتنی مدت سے
اسی کو آج وہ بیگانہ وار چھوڑ گئے

رگوں میں اک تپشِ دردِ کار جاگ اٹھی
دلوں میں اک خلشِ انتظار چھوڑ گئے

ہوائے شام سے آنے لگی صدائے فغاں
فضائے شوق کو ماتم گسار چھوڑ گئے

نشاطِ محفلِ بلبل و بہار لوٹ لیا
نصیب میں غمِ لیل و نہار چھوڑ گئے

گھٹائیں چھائی ہیں، ساون ہے، مینہ بہ شدت ہے

وہ کس سمے میں ہمیں اشکبار چھوڑ گئے

دلِ حزیں ہے اب اور عہدِ رفتہ کا ماتم

چمن کے سینے پہ داغِ بہار چھوڑ گئے

چھڑا کے دامنِ امید دل کے ہاتھوں سے

سوادِ یاس میں ماتم گسار چھوڑ گئے

نہ آیا رحم مرے آنسوؤں کی منت پر

کیا قبول نہ پھولوں کا ہار چھوڑ گئے

تمام عمر ہے اب اور فراق کی راتیں

یہ نقشِ گیسوئے مشکیں بہار چھوڑ گئے

امید و شوق سے آباد تھا ہمارا دل

امید و شوق کہاں اک مزار چھوڑ گئے

ترس رہے ہیں مسرت کو عشق کے ارماں

ہمیں ستم زدہ و سوگوار چھوڑ گئے

امید خستہ ہے، دل مضطرب، خوشی بسمل

جہانِ شوق کو آشفتہ کار چھوڑ گئے

نگاہِ درد کی عرضِ حزیں قبول نہ کی
ہمیں وہ غمزدہ و دل فگار چھوڑ گئے
کسے خبر ہے کہ اب پھر کبھی ملیں نہ ملیں
نظر میں اک ابدی انتظار چھوڑ گئے
ہماری یاد بھلا کر وہ چل دیئے اختر
اور اپنی یاد، فقط یادگار چھوڑ گئے

آستانے

قفس سے رہا ہوں، اب مجبورِ فریاد نہیں
کوئی کیا جانے کہ خوں گشتہ ہے دل شاد نہیں
میں نے سمجھا تھا کہ ہے عہدِ وفا عہدِ وفا
سچ کہا تم نے کہ مجبور تو آزاد نہیں

کیا کہوں کس لیے رہ رہ کے تڑپ اٹھتا ہوں
دل میں اک تیر ہے پیوست، تری یاد نہیں
کیا مرے خواب میں آنے کو بھی قدغن ہے یہاں
قید ہے جسم تو کیا روح بھی آزاد نہیں

یاد ہے وہ شبِ مہتاب میں آہنگِ رباب؟
اور وہ نکہتِ صحرا کہ چمن زاد نہیں

یاد ہے عکسِ شفق سے وہ دلِ دریا میں
منظرِ حسن کہ منت کشِ بہزاد نہیں
یاد ہے چھاؤں میں تاڑوں کی وہ بیر کھانا
اور وہ شکوۂ قدرت کہ "ہم آزاد نہیں"

کیا کہوں دل آہ بھلایا نہیں جاتا مجھ سے
وہی پیمانِ محبت جو تمہیں یاد نہیں
بنتے بنتے تری تصویر بگڑ جاتی ہے
یاس میں آہ تصور بھی تو آزاد نہیں

چاندنی ۔ موسمِ گل، صحنِ چمن، غارتِ ناز
خواب دیکھا تھا کہ کچھ یاد ہے کچھ یاد نہیں

صبحِ دل آرا سے

کہنے لگی یوں صبح ، مری صبحِ دلآرا
ہے سرد ہوا ، مست فضا ، شوخ نظارہ
ہنستا ہے تمہیں دیکھ کے کیوں صبح کا تارا؟
میں نے یہ کہا آج ہے ہنگام خوشی کا
ہر موجِ صبا لاتی ہے پیغام خوشی کا
اِک دعوتِ بہجت ہے ہر اک مست نظارہ
کہنے لگی ، ہو شاعرِ مدہوش و جواں تُم
سرمستیٔ عشرت سے ہو رسوائے زماں تُم
دُنیا میں فقط عیش ہے مقصود تمہارا
کی عرض کہ بیشک ہوں میں اک شاعرِ بےخود
خوابوں کا پرستار ہوں اور ساحرِ بےخود
تقدیر کا دامن ہے مگر میرا سہارا

اے جانِ جہاں آج تو ہے زینتِ پہلو
شادابیِ آغوش ہے اور جنتِ پہلو
ہنستا ہے مجھے دیکھ کے یوں صبح کا تارا

جامِ مئے گلنار پلا دے

جامِ مئے گلنار پلا دے
ساغرِ نور و نار پلا دے
خمکدۂ سرشار پلا دے
پھول پلا دے، خار پلا دے

دل میں چھپائیں چاہ کہاں تک
لب پہ ہر دم آہ کہاں تک
عشق میں پھریں گمراہ کہاں تک
راہ بتا دے، راہ بتا دے!

نکہتِ زلفِ حور ہو جس میں
خوابِ نگاہِ دلبر ہو جس میں

آگ ہو جس میں نور ہو جس میں
ساقی ایسا نور پلا دے

کھیل رہی ہوں جس میں بہاریں
دیکھ کے جس کو سب کو لبھا دیں
ایسی پری شیشے میں اتاریں
سب کو بھلا دے سب کو بھلا دے

ساقیہ! اٹھ اک جام پلا دے
بادۂ لالہ فام پلا دے
نورِ نگاہِ شام پلا دے
اک پیاسے کی پیاس بجھا دے

ساغرِ رنگیں شراب پلا دے
جامِ شبِ مہتاب پلا دے
رنگِ گلِ شاداب پلا دے
مست بنا دے، مست بنا دے

عید کا چاند دیکھ کر

افق پہ مسجد کے پاس ہے چاند عید کا محو جلوہ باری
کہ بحر نیلی پہ تیرتی پھر رہی ہے زرّین اک عماری
شفق کی سرخی سے مست و مدہوش ہو رہی ہیں فضائیں ساری
زمین کا ایک ایک ذرّہ ہے محو شانِ جمالِ باری
جہانِ ہستی کا چپّہ چپّہ فضائے دامانِ رنگ و بو ہے
زمیں سے تا چرخ آج ہر سمت سازو سامانِ رنگ و بو ہے

خوشی کے جلوے ہیں منتشر دیار سے طرب زار، گلستاں ہیں
جہاں نہاں آج ہائے خوشبوئے لالہ و گل رواں دواں ہیں
گھنیری شاخوں پہ جس طرف دیکھو بلبلیں مست و نغمہ خواں ہیں
حسین کلیاں خوشی سے پھولی نہیں سماتی ہیں شادماں ہیں
چمن کا ایک ایک غنچہ و گل بہار کے گیت گا رہا ہے
ہلال ہے محو جلوہ کاری، زمانہ خوشیاں منا رہا ہے۔

ہلال کو جلوہ گر جو دیکھا تو اک حسینہ نے دلبری سے
فلک کی نگینیوں کی جانب اٹھائے ہیں ہاتھ خوشدلی سے
نگاہِ خاموش، فتنے لاکھوں برستے ہیں جن کی خامشی سے
وہ اس کا چہرہ کہ پھول کوئی کھلا ہے تازگی روشنی سے
زبان خاموش عالمِ سرخوشی ہیں مدہوش و نغمہ زا ہے
حضورِ خالق میں اس کی خاموشی اس طرح مائلِ دعا ہے

الٰہی تیرا ہزار شکر آج پھر خوشی کا زمانہ آیا
ہلالِ عید اِک برس کے بعد آج تو نے پھر آنکھ کو دکھایا
ہر ایک ذرّے پہ ہو رہا ہے محیط تیرے کرم کا سایہ
خوشی سے ہے محو حمد دنیا میں آج ہر اپنا اور پرایا
زمانے بھر کو خوشی مبارک یہ دورۂ فرخی مبارک
جو دل شکستہ ہیں غم سے اُن کو یہ عالمِ خوشدلی مبارک

ہر ایک کو قیدِ رنج و درد و الم سے آزاد کر الٰہی!
غریب ناشاد ہستیوں کو کرم سے پھر شاد کر الٰہی!

ستمگروں کی ستمگری کو خراب و برباد کر الٰہی!

جہاں کے اُجڑے ہوئے دلوں کے گھروں کو آباد کر الٰہی!

دلوں کی بستی میں ہو فروزاں خوشی کی یہ روشنی ہمیشہ

جہاں کے ایک ایک ذرّے کے لب پہ ہو الٰہی ہنسی ہمیشہ

مکالمہ

لیلےٰ ——— جگمگاتے ہوئے تاروں نے بلایا ہے ہمیں
مجنوں ——— کیا کریں جانتے ہیں دنیا نے ستایا ہے ہمیں
لیلےٰ ——— عشق کے صدمے اُٹھائیں کب تک
مجنوں ——— گیت امید کے گائیں کب تک
دونوں مل کر ——— آہ تقدیر یہ کیا رنگ دکھایا ہے ہمیں
جگمگاتے ہوئے تاروں نے بلایا ہے ہمیں
کیا کریں جانتے ہیں دنیا نے ستایا ہے ہمیں
لیلےٰ ——— کشتی راہ ولا دے کوئی
مجنوں ——— جنتِ عشق دکھا دے کوئی
دونوں مل کر ——— عشق کی مست ہواؤں نے لبھایا ہے ہمیں
جگمگاتے ہوئے تاروں نے بلایا ہے ہمیں
کیا کریں جانتے ہیں دنیا نے ستایا ہے ہمیں

لیلےٰ ـــــــ دو جہاں بستی ہیں جہاں وہ دنیا

مجنوں ـــــــ خوشیاں بستی ہیں جہاں وہ دنیا

دونوں مل کر ـــــ ایسی دنیا کے نظاروں نے رجھایا ہے ہمیں

جگمگاتے ہوئے تاروں نے بلایا ہے ہمیں

کیا کریں جاتے ہیں دنیا نے ستایا ہے ہمیں

لیلےٰ ـــــــ اے زمانے تجھے ہم چھوڑ چلے

مجنوں ـــــــ تجھ سے جو آس بھی وہ توڑ چلے

دونوں مل کر ـــــ رات دن تو نے محبت میں جلایا ہے ہمیں

جگمگاتے ہوئے تاروں نے بلایا ہے ہمیں

کیا کریں جاتے ہیں دنیا نے ستایا ہے ہمیں

چرواہے کی بنسی

شفق کی چھاؤں میں چرواہا جب بنسی بجاتا ہے
تصور میں مرے، ماضی کے نقشے کھینچ لاتا ہے
نظر میں ایک بھولا بسرا عالم لہلہاتا ہے

وہ بے پروائی جس سے ایک دن آباد تھا بچپن
وہ بے فکری کی باتیں جن سے اک دن شاد تھا بچپن
وہی نظارہ اس کے زمزموں میں مسکراتا ہے

مرے افکار طفلی کو ہے نسبت اس کے نغموں سے
میں بچپن میں کیا کرتا تھا الفت اس کے نغموں سے
جبھی بنسی کی لے میں عہدِ طفلی جھلملاتا ہے

نظر میں جھومتا ہے بن کے رنگیں خواب کا عالم
وہ صحرا کے نظارے اور وہ مہتاب کا عالم
وہی افسانہ اس حبشی کے لب پہ گنگناتا ہے

گیا بچپن مٹا وہ سن، جوانی بیتنے آئی
سحر ہونے کو ہے، رنگیں کہانی بیتنے آئی
یہ چرواہا مجھے کیوں یاد پھر اُن کی دلاتا ہے

انقلابِ ایشیا

آگیا وقت کہ دُنیا کی حقیقت بدلے!
آسماں بدلے، زمیں بدلے، یہ قدرت بدلے!
مغربی قوموں کی بڑھتی ہوئی تہذیب رکے
مشرقی قوموں کی بگڑی ہوئی قسمت بدلے
عہدِ حاضر کا بشر کم نہیں حیوانوں سے
یہ بشر بدلے، یہ رنگِ بشریت بدلے
رنگ اور خون کی تمیز زمانے سے مٹے
نسل اور ذات کی تفریق کی لعنت بدلے
بندگی پر بھی خدائی کے ہیں دعوے کب سے
اب تو یارب ترے بندوں کی طبیعت بدلے

بہرحال ......

جو ہیں بد اصل اُن کو راس کب آتی ہے آزادی
غبارِ راہ کو بے راہ کر جاتی ہے آزادی

فضائے ہند و پاکستاں میں شورِ حشر برپا ہے
غریبوں کی فغاں بن بن کے چلاتی ہے آزادی

غلامانِ ازل کی فطرتوں کا پاس ہے کتنا
غلامی کو لیے ہمراہ مرجاتی ہے آزادی

لہو اُن کا لہو ہے جن میں غیرت ہو شرافت ہو
مگر مشرق میں جھوٹی سُرخیاں پاتی ہے آزادی

لہو رونے کی عادت ہے جنہیں آزاد کیا ہونگے
لہو بن کر براہِ چشم بہہ جاتی ہے آزادی

دنائیت ہوتی ہے بیدار پست اقوام میں جس دم
ہوا و حرص کے پردوں میں سو جاتی ہے آزادی

جو شرماتی نہیں اپنی کمینہ طرز و خصلت سے
بچا ہے ایسی قوموں سے جو شرماتی ہے آزادی

فنا ہوتا ہے وہ گمراہ ہو کہ بحر جوشاں ہیں
حبابِ بے نوا کو جب پسند آتی ہے آزادی

ہر زبہ ان نبرد آرا کی قسمت میں یہ عظمت ہے
جو ہیں روباہ فطرت اُن کو کب بھاتی ہے آزادی

جہاں ذاتی ہوس ہمدردیوں سے اک شغلِ غلامی ہو
وہاں اک داغ رہ جاتا ہے کھو جاتی ہے آزادی

تڑپ ہوتی ہے ذاتی نفع کی ہر ایک کے دل میں
بظاہر سب کے دل کو گرچہ تڑپاتی ہے آزادی

دعوتِ جہاد

مسندِ عیش سے اُٹھ، منزلِ پرخار میں آ!
بزمِ جم چھوڑ کے، بزمِ رسن و دار میں آ!
عشرتِ کدۂ گیتی سے نہیں واقفِ پروینہ
کہہ وہ یہ لطف اگر چاہے تو کہسار میں آ!
تذکرۂ مشہدِ کشمیر پہ اشکِ خونیں
دلِ غمدیدہ اس اُجڑے ہوئے گلزار میں آ!
تابکے بندگیِ ساغر و مینا، اختر
اب تو اللہ کے بندے صفِ احرار میں آ!

کبھی کچھ، کبھی کچھ

کبھی سوچتا ہوں کہ تلوار اٹھاؤں

سپاہی بنوں اور میداں میں پہنچوں

اور اعدائے ملّت کو نیچا دکھاؤں

میں شیروں کی صورت نیستاں میں پہنچوں

کبھی سوچتا ہوں کہ شاعر بنوں میں

تڑپ اُٹھّے دنیا، وہ اشعار لکھّوں

قلم کی خدائی کا ساحر بنوں میں

ہو شرمندہ فطرت وہ اسرار لکھّوں

کبھی سوچتا ہوں کہ بن کر مصوّر

بناؤں وہ تصویر خونِ جگر سے

کہ آجائے پردے سے چھن کر یہ صور
زمانے کو حیرت ہو جس کے اثر سے

کبھی سوچتا ہوں تو اگر بنوں میں
فضا کو نواؤں سے معمور کر دو
جہانِ غنا کا پیمبر بنوں میں
خدائی کو نغموں سے مسحور کر دو

کبھی سوچتا ہوں کہ سب کچھ ہوں میں
نہ تھا پہلے کچھ لیکن اب کچھ ہوں میں

دلیرانِ وطن کے نام

سر کٹا کر سرِ سامانِ وطن ہونا ہے
نوجوانو! ہمیں قربانِ وطن ہونا ہے

رگِ ہر غنچہ ہو سیراب ہمارے خوں سے
یوں فدائے گل و ریحانِ وطن ہونا ہے

صفِ اعدا کو گماں ہو کوئی طوفاں آیا
یوں صف آرا سرِ میدانِ وطن ہونا ہے

ان گلوں پہ ہو نہ کیوں خلد کو بھی رشک جنہیں
زینتِ گورِ شہیدانِ وطن ہونا ہے

اللہ اللہ رے اُس تیغ کی قسمت جس کو
رونقِ دستِ دلیرانِ وطن ہونا ہے

موت بھی روئے گی خوں اُن کی بری حالت پر
جن کو مغلوبِ دلیرانِ وطن ہونا ہے

جان دینے کے لیے کیوں نہ ہوں تیار اختر
اک نہ اک دن ہمیں گر جانِ وطن ہونا ہے

سالِ نو پر

ایک غریب الوطن سپاہی کا پیغام
میدانِ جنگ سے

○
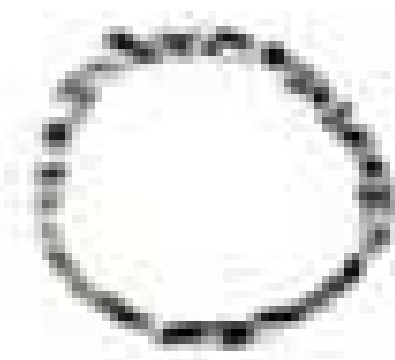
سالِ نو آیا ہے اور ہم اپنے گھر سے دُور ہیں
پھر بھی اس دُوری کا ہم کو غم نہیں، مسرور ہیں!
گھر کی خدمت ہی کی خاطر، گھر سے چل کر آئے ہیں
پاسبانیٔ وطن کا جذبہ دل میں لائے ہیں!
آج کے دن دُور ہیں گھر سے تو پھر کیا فکر ہے
گھر کو بھیڑیوں سے بچائیں ہم کو اس کا فکر ہے
زندگی باقی ہے تو دیکھیں گے اکثر سالِ نو!
ملک کی تقدیر نو، اور قوم کا اقبال نو!

آج تو ملّت کو دشمن سے بچانا ہے ہمیں
لشکرِ دشمن کو میداں سے بھگانا ہے ہمیں!
بے ضرورت بہجتوں سے ہم کو کچھ مطلب نہیں!
سالِ نو کی عشرتوں سے ہم کو کچھ مطلب نہیں!
سالِ نَو پر اپنے گھر کو یاد کرنے سے غرض!
ہم سپاہی ہیں، ہمیں لڑنے سے، مرنے سے غرض
حسنِ نو روزی عیاں ہے تیغِ جوہر دار سے
سالِ نُو کے نغمے ہم سنتے ہیں ہر جھنکار سے!

اپنا پرچم جب عدو کے ملک میں لہرائے گا!
اے وطن والو! ہمارا سالِ نو تب آئیگا!

نعم البدل

جنگ کا میدان ہمیں صحنِ چمن سے کم نہیں!
بوئے خوں، خوشبوئے نسرین و سمن سے کم نہیں!
کیوں نہ چومیں ہم لبِ شمشیرِ جوہر دار کو؟
اس کی لذّت نازنینوں کے دہن سے کم نہیں!
جذبۂ حبِّ وطن سے خار بھی گُل ہو گئے
دشتِ غربت، ہم کو گلزارِ وطن سے کم نہیں!
آگ اور بارود کی گلکاریاں، میدان میں
ہم کو سیرِ گلفشانیٔ چمن سے کم نہیں!
شعلوں کی بارش جگاتی ہے ہمارے ولولے
سیلِ آتش، موجِ راوی و جمن سے کم نہیں!
بم کی آوازوں سے بڑھتا ہے ہمارا حوصلہ
یہ صدائیں نغمۂ باغِ عدن سے کم نہیں!
کیوں نہ سینے سے لگائیں تیغ خوں آلود کو
یہ کسی رنگیں عذارِ سیم تن سے کم نہیں!

جھونپڑی کا دیا

اک دیا دُور سے ہنستا سا نظر آتا ہے
ننھّے تارے کی طرح کرنیں سی برساتا ہے

گرچہ بجلی نہیں، شعلہ نہیں، مہتاب نہیں
پھر بھی رہگیر کو یہ راستہ بتلاتا ہے

ٹوٹ کر رہ گئی اک شاخ پہ تارے کی کرن
یا کوئی جگنو، چمک دُور سے دکھلاتا ہے

دامنِ یاس میں ہو جیسے شرارِ اُمّید
یوں ہواؤں کے تھپیڑوں سے یہ ٹکراتا ہے

جیسے ارمان کی ننھی سی کرن ہو دل میں
یوں کسی جھونپڑی میں رنگ یہ دکھلاتا ہے

اخترِ صبح کی رقصندہ ضیا کی صورت
پہلوئے شب میں مچلتا سا نظر آتا ہے

کسی بڑھیا کے سیہ خانے کی رونق بن کر
اثرِ تیرگیٔ بخت کو بہلاتا ہے
رات کی تیرہ فضاؤں کی نظر بن بن کر
اک پُر اسرار جھلک دشت کو دکھلاتا ہے

وطن کے شہیدانِ جنگ

اثر

موسمِ بہار

پیارے وطن کی آنکھ کے تارے کدھر گئے؟
بادِ خزاں! وہ پھول ہمارے کدھر گئے؟
حسرت سے ڈھونڈھتی ہے جنہیں آج فصلِ گُل
وہ طالعِ وطن کے ستارے کدھر گئے؟
بہرِ وطن جو کھیلتے تھے اپنی جان پر
جانبازی کے وہ زندہ نظارے کدھر گئے؟
جن کے دلوں میں عشقِ وطن تھا شرارہ ریز
ہاں وہ وطن کے عشق کے مارے کدھر گئے؟
تھی جن کی ضو سے اپنی یہ دنیا حریفِ طور
وہ شمعِ زندگی کے شرارے کدھر گئے؟

کہہ دو کہ بہرِ فاتحہ آئی ہے نو بہار!
اور تازہ پھول قبر پہ لائی ہے نو بہار!

عشق و آزادی و شعر

بند ہے راہ چمکتی ہوئی تلواروں سے!
کہہ دو آزادیٔ کامل کے طلبگاروں سے!

دُور ہے دُور ابھی منزلِ مقصود ابھی
اور گذرنا ہے بیابانوں سے، کہساروں سے!

ایک آزاد نفس، عمرِ قفس سے بہتر
یہ صدا آتی ہے میسور کے کہساروں سے

خودکشی کی بھی اجازت نہیں، ابتر ہم کو
کھیلتے تھے کبھی ہم غیر کی تلواروں سے!

گلشنِ دہر میں گلچینی کا ارماں ہے اگر
دست و دامن کو بچائے نہ رکھو خاروں سے!

مشرقی قوموں کی قدرت نے اگر کی امداد
ایک دن سمجھیں گی، یورپ کے سیہ کاروں سے!

مے دانیوں سے لیا کام جو کچھ قوموں نے
نہ لیا سیزر و چنگیز نے ہتھیاروں سے!

باغباں ہم کو بلا بھی تو بہ شکلِ رہزن
پھول کیا پتّے بھی غائب ہیں چمن زاروں سے!

دیوِ افلاس کا نعرہ ہے فضا میں لرزاں
کہ عوض بھوک کا لو دہر کے خونخواروں سے!

ایک بنئے کی بہی پر یہ لکھا تھا طغرا!
کہ "خدا کو ہے محبّت، تو ہے زرداروں سے"!

ہمصفیروں ہی کو بلوا دے قفس تک صیّاد
ایسی ہی ضد ہے اگر تجھ کو گرفتاروں سے!

عشق و آزادی و شعر اپنا ہے پیشہ اختر
ہم کو سرکاروں سے مطلب ہے نہ درباروں سے!

کسان

رگ رگ میں جوشِ محنت و ذوقِ عمل لیے
کھیتوں سے آ رہا ہے کسان اپنا ہل لیے
تن پر غبارِ گرد، گل افشاں کیے ہوئے
محنت کا غازہ رُخ پہ فروزاں کیے ہوئے
دُنیائے ہست و بود پہ احسان اس کا ہے
خدمت کرے زمانے کی، ایمان اس کا ہے
رقصاں ہے کائنات کی رگ رگ میں اس کا خوں
لرزاں ہے شش جہات کی رگ رگ میں اس کا خوں!
گو محنت اور فکر سے فرصت نہیں اسے
قسمت سے پھر بھی کوئی شکایت نہیں اسے!
آنکھوں میں اک فسانۂ خنداں ہے جلوہ گر
ہونٹوں پہ نغمۂ طرب افشاں ہے جلوہ گر
گھر کی طرف رواں ہے کچھ اس رنگ ڈھنگ سے
جیسے سپاہی آتا ہو میدانِ جنگ سے!

کسان کا مستقبل

نونہالِ آرزو پھر بارور ہونے کو ہے
قسمتِ دہقان، اگر تابندہ تر ہونے کو ہے

ظلمت آبادِ تنزّل، ہوگا روشن نور سے
حسنِ لیلائے ترقی جلوہ گر ہونے کو ہے

پنجۂ افلاس سے آزادیاں ہوں گی نصیب
پھر رہا قیدِ صعوبت سے یہ گھر ہونے کو ہے

جس کا خرمن ایک دن تھا صیدِ صد برق و شرر
اب وہی صیادِ صد برق و شرر ہونے کو ہے

جن بیابانوں پہ رہتی تھی خزاں چھائی ہوئی
اب انہی پر نو بہاروں کی نظر ہونے کو ہے

ہو رہا ہے دور بیتے اور بہی کا دور آج
اور ابھی رفتار اس کی تیز تر ہونے کو ہے

اب عدالت اور وکیلوں کے اٹھائیں گے نہ ناز
ملک میں پنچایتوں کا یہ اثر ہونے کو ہے
زندگی تازہ آجانے کو ہے دیہات میں
چپہ چپہ ایک فردوسِ نظر ہونے کو ہے
کتنا احساں ہے تمدن پہ کسی دہقان کا
فیصلہ اس کا باندازِ دگر ہونے کو ہے

طوفان کی آمد

کسی کمزور کو جینے کا نہ ہوگا کوئی حق

اب تو کچھ ایسا ہی سامان ہوا جاتا ہے!

جو ممالک ہیں نہتے، ہیں فنا کے قابل

اہلِ طاقت کا یہ ایمان ہوا جاتا ہے!

اس زمانے میں ہیں کم مایہ جو اقوام، اُن کے

کفن و گور کا سامان ہوا جاتا ہے!

پھر برسنے کو ہیں اقصائے زمیں پر فتنے

پھر بپا حشر کا طوفان ہوا جاتا ہے!

مطلعِ دہر پہ چھانے کو ہے پھر جنگ کا ابر

امن کا گلکدہ ویران ہوا جاتا ہے!

امیر و غریب

دُنیا کا ہر آرام امیروں کے لیے ہے
پھر کونسی شے ہے جو فقیروں کے لیے ہے

بدبخت مریدوں پہ بھی یارب نگہِ لطف
مانا کہ جو نعمت ہے وہ پیروں کے لیے ہے!

اک سیٹھ نے گندم کی یہ تعریف نئی کی
کھانے کے لیے کب ہے ذخیروں کے لیے ہے!

اب تیسرے درجے سے بھی محروم ہیں مفلس
اوّل ہے، تو اوّل سے امیروں کے لیے ہے!

"اغیار" یہ کیوں ہوتے نہیں اب ان کے مظالم
یہ فخر تو صرف ان کے اسیروں کے لیے ہے!

پیٹرول تو کیا کیروسن آئیل نہیں ملتا
موٹر تو بڑی شے ہے وزیروں کے لیے ہے

اب نقلِ مضامین، جو کمالِ اَزلی ہے
"تقسیم شدہ" اُردو کے مدیروں کے لیے ہے
غیرت جسے کہتے ہیں وہ مفلس کا ہے حصہ
ہیروں کے لیے ہے نہ امیروں کے لیے ہے
لکھواتے ہیں وہ گالیاں اخبار میں ہم کو
اختر یہ سزا ہم سے شریروں کے لیے ہے

عیادت

تندرستی کا گلہ کیوں ہے شکایت کیا ہے؟
میری بیمار، بتا تو تیری حالت کیا ہے؟
رو دیئے جب کبھی سُنی درد بھری کوئی خبر
درد ہی درد ہے یا رب کہ طبیعت کیا ہے؟
عشق بیماری ہے اور کتنی حسین بیماری
کیا خبر بے خبر دل کو کہ یہ لذت کیا ہے؟
اُن کی صحت کی خبر آئے گی، جلد آئے گی
دلِ ناداں تجھے آخر کو یہ وحشت کیا ہے؟
ساری دنیا کے مریضوں کو شفا دے یا رب
آج احساس ہُوا دل کو علالت کیا ہے؟
سامنے ہوں تو فدا کر دیں دل وجان اُن پر
ہم نہیں جانتے اختر کہ عیادت کیا ہے؟

ایک مزدور کی زندگی

سوزِ دل میرے لیے ، زخمِ جگر میرے لیے
زندگی ہے مری اک رقصِ شرر میرے لیے
چرخ نے میری تباہی پہ بہائے آنسو
دیدۂ انجم و ناہید ہے تر میرے لیے
قسمتِ دولتِ وجداں ہے بہ اندازۂ ظرف
رنگ و بو تیرے لیے ، سوز و شرر میرے لیے
زندگی گرچہ ہے مجبوریٔ فطرت کا ثبوت
پھر بھی ہاں دشت و جبل ، زیر و زبر میرے لیے
خوف ، محنت سے نہیں ، ہمدم آرام پسند
خون اور خاک تو ہے شہد و شکر میرے لیے
پاس منظور ہے فطرت کو مری رفعت کا
ورنہ گردش میں ہیں کیوں شمس و قمر میرے لیے

بوالہوس! آ کہ باندازۂ ہمت خوش ہوں
برگ و گل تیرے لیے، تیغ و تبر میرے لیے
تا ابد روئے گی اختر جسے چشمِ دوراں
کی ہے مخصوص ازل نے وہ نظر میرے لیے

فروغِ سحر

بہار آئی ہے شاداب باغِ امکاں ہے
چمن کے رُخ سے فروغِ سحر نمایاں ہے
کلی کے ساز پہ بلبل ترانہ افشاں ہے

بچھائی سبزۂ گلزار نے بساط نئی
سجائی پھولوں نے اک محفلِ نشاط نئی
جو ذرّہ، ذرّہ ہے خوش، پتہ پتہ خنداں ہے

ہے دیدنی گل و نسرین و نسترن کی بہار
نظر فروز ہے ریحان و یاسمن کی بہار
نگاہِ نرگسِ شاداب جس سے حیراں ہے

پھر ہوا سے دعوتِ جوشِ جنوں آنے لگی

پھر ہوا سے دعوتِ جوشِ جنوں آنے لگی
پھر بہار آئی چمن سے بوئے خوں آنے لگی

پھر ہوئی کنجشک کو حملے کی جرأت باز پہ
پھر صدائے خندۂ گردوںِ دوں آنے لگی

ہے نہتے بے کسوں پہ ہاتھ اُٹھانا کب روا
شرم، لیکن ظالموں کو شرم کیوں آنے لگی

پھر کوئی مظلوم تیرِ ظلم سے زخمی ہوا
پھر صدائے نالۂ صیدِ زبوں آنے لگی

اشکِ خونیں سے ہوئی لبریز چشمِ سرمگیں
دل سے آوازِ امیدِ سرنگوں آنے لگی

کیا گذری ....

وہ پوچھتے ہیں سپہرِ بریں پہ کیا گزری
جنہیں خبر نہیں اہلِ زمیں پہ کیا گزری

ہوا ہے خبط انہیں خارجی سیاست کا
جو بے خبر ہیں کہ اس سرزمیں پہ کیا گزری

خزاں نے لوٹ کے برباد کر دیا گلچیں
خبر تو لے کہ تری گُل زمیں پہ کیا گزری

تو ایسے سمے میں آ پیاری!

گلشن کی فضائیں سب چپ ہیں — بلبل کی نوائیں سب چپ ہیں
کوئل کی صدائیں سب چپ ہیں — آ پریت کے گیت سنا پیاری
تو ایسے سمے میں آ پیاری

ہے غم کی گھٹا گھر کر آئی — اور یاس نے چھاونی ہی چھائی
میں ہوں اور میری تنہائی — امید کی بزم سجا پیاری
تو ایسے سمے میں آ پیاری

تنہائی ہے خاموشی ہے — فطرت غرقِ مدہوشی ہے
اک عالم سکر فروشی ہے — بیہوش کو ہوش میں لا پیاری
تو ایسے سمے میں آ پیاری

کلیوں پر تتلی آتی ہے — اور پریت کے گیت سناتی ہے
بھولے ہوئے رنگ دکھاتی ہے — بھولے ہوئے رنگ دکھا پیاری
تو ایسے سمے میں آ پیاری

گھنگھور گھٹائیں چھائی ہیں سرمست ہوائیں آئی ہیں
جو تیرا سندیسہ لائی ہیں آ بدلی بن کر چھا پیاری
تو ایسے سمے میں آ پیاری

دنیا ساری خوابیدہ ہے اور فطرت آرامیدہ ہے
بیدار نظر رنجیدہ ہے اک سپنا بن کر چھا پیاری
تو ایسے سمے میں آ پیاری

ہم عشق کے مارے بیٹھے ہیں دریا کے کنارے بیٹھے ہیں
بس ایک سہارے بیٹھے ہیں آ ایک جھلک دکھلا پیاری
تو ایسے سمے میں آ پیاری

دامن پہ آنکھوں کا نم ہے سینے میں شورِ ماتم ہے
اختر ہے اور حشرِ غم ہے تو اور اک حشر اٹھا پیاری
تو ایسے سمے میں آ پیاری

غزلیات

غزل

(۱)

آ کہ پھر بزمِ تمنّا میں چراغاں کر دیں
جذبۂ شوق سے ہر گُل کو گلستاں کر دیں

صحنِ میخانہ کو پھولوں سے بسا دیں ساقی!
اِس ادا سے کہ چمن زار کو حیراں کر دیں

ایک مدّت سے ہے خاموش محبّت کی فضا
نغمۂ عشق سے آباد نیستاں کر دیں

غزل

(۲)

ہے نشاطِ لالہ و گُل میں کیا، ہے بہارِ سرو و سمن میں کیا

مجھے کب فراغ ہے سیر کا، میں کروں گا جا کے چمن میں کیا؟
مرا واسطہ ہے ختا سے کیا، مرا کام باغِ ختن میں کیا؟
وہ شمیم روح فزا نہیں ترے گیسوؤں کی شکن میں کیا؟
ہمہ فتنہ و ہمہ فتنہ گر، ہمہ تیرہ دل، ہمہ خیرہ سر
ہے یہ حالِ اہلِ وطن اگر، تو کرینگے جا کے وطن میں کیا؟
وہ سواد رنگ و نظر نہیں، وہ فضائے شام و سحر نہیں
وہ بہارِ باغ و شجر نہیں تو ہے لطف سیرِ چمن میں کیا

غزل

(۳)

کسی کی جفا بن گئی ہے جوانی
الٰہی یہ کیا بن گئی ہے جوانی
حسینانِ عالم نے جس دن سے دیکھا
تو اک ماسوا بن گئی ہے جوانی
جوانی میں لیں اس قدر بد دعائیں
کہ اک بد دعا بن گئی ہے جوانی
نگاہوں نے کچھ ایسا پیغام بھیجا

کہ پیکِ صبا بن گئی ہے جوانی
نہیں پوچھتا کوئی اختر خدا کو
یہ کیسا خدا بن گئی ہے جوانی

غزل

(۴۴)

یوں تو کس پھول سے رنگت نہ گئی بو نہ گئی
اے محبت! مرے پہلو سے مگر تو نہ گئی
مٹ چلے میری امیدوں کی طرح حرف مگر
آج تک تیرے خطوں سے تری خوشبو نہ گئی
فصلِ گل ختم ہوئی، رنگِ سمن خواب ہوا
میری آنکھوں سے مگر میری سمن رو نہ گئی
کب بہاروں پہ ترے رنگ کا سایہ نہ پڑا
کب ترے گیسوؤں کو بادِ سحر چھو نہ گئی
تیرے گیسوئے معنبر کو کبھی چھیڑا تھا
میرے ہاتھوں سے ابھی تک تری خوشبو نہ گئی

غزل

(۵)

خوشبو اڑا کے لائی نہ زلفِ نگار سے
مجھ کو شکایتیں ہیں نسیمِ بہار سے

غمگین ہو نہ کوئی غمِ روزگار سے
ایک دن بدل ہی دینگے خزاں کو بہار سے

ملتی نجات اگر غمِ لیل و نہار سے
سنتے کبھی خزاں کی کہانی بہار سے

شبنم نہیں ہے خوفِ خزاں سے حسین پھول
رو رو کے مل رہے ہیں گلے نو بہار سے

اٹھتے نہیں ہیں اب تو دعا کے لیے بھی ہاتھ
اس درجہ نا امید ہیں پروردگار سے

جس پھول کو خزاں کا ابھی تجربہ نہیں
کہہ دو یہ اس سے دل نہ لگانا بہار سے

اس دل کو خاک کر کے زمانے نے رکھ دیا
کھیلا کیا ہمیشہ جو برق و شرر سے

کیوں شکوہ سُن کے شوخ نگاہیں بدل گئیں
کیوں رنگ اُڑ چلا ترے پھولوں کے ہار سے
اختر کبھی تو پہنچیں گے اپنی مراد کو
مایوس ہوں نہ رحمتِ پروردگار سے

غزل

(۶)

بھلاؤ گے بہت، لیکن تمہیں ہم یاد آئیں گے
بہت یاد آئیں گے پھر بھی بہت کم یاد آئیں گے!
گھٹا چھا جائے گی دل پہ غبارِ رنج و حسرت کی
ہمیں جب بھی ترے گیسوئے برہم یاد آئیں گے!
بھلا بیٹھے ہو ہم کو آج لیکن یہ سمجھ لینا
بہت پچھتاؤ گے جس وقت، کل ہم یاد آئیں گے!
بہت روئیں گے ہمدم، دشتِ غربت میں ہمیں جس دم
کسی کے دیدۂ غمناک و پرنم یاد آئیں گے!
دلِ غمگیں ہے میرا اور یہ حسرت رات دن اختر
کہ اپنے بھولنے والے کو کب ہم یاد آئیں گے!

غزل

(۷)

وہ دُور سے نقاب اُٹھا کر چلے گئے
آنکھوں پہ بجلیاں سی گرا کر چلے گئے
دامن بچا کے، ہنس کے، لجا کر چلے گئے
کیا کیا، لحد پہ پھُول چڑھا کر چلے گئے
سینے میں اک تپش سی بسا کر چلے گئے
کیسے مزے کی آگ لگا کر چلے گئے

شاداب ہو سکا نہ گلستانِ آرزو
کتنے ہی ابر، باغ پہ چھا کر چلے گئے
بادِ بہار، آگ لگا کر چلی گئی
ابرِ بہار ہم کو رلا کر چلے گئے
آنسو نہ تھم سکے مری چشمِ امید کے
کتنے ہی موسم آئے اور آ کر چلے گئے
اختر برا ہو بے خودیِ جذب و شوق کا
کس کو خبر کب آئے کب آ کر چلے گئے

غزل

(۸)

میں اپنے شوق کی دھن میں دعا بھی بھول گیا
وہ پاس آئے تو نامِ خدا بھی بھول گیا

اب اس سے بڑھ کے بھی کچھ اور بے کسی ہوگی
الٰہی، اب تو مرا دل دعا بھی بھول گیا

امید کیا ہو کسی سے وفا شعاری کی
وفا کہاں کہ زمانہ جفا بھی بھول گیا

خبر لے کون، محبت کے درد مندوں کی
جہاں میں بھیج کے ہم کو خدا بھی بھول گیا

غزل

(۹)

دنیا میں ترے عشق کا چرچا نہ کریں گے
مر جائیں گے لیکن تجھے رسوا نہ کریں گے

شکوہ بیاں کریں گے کبھی دل نہ ہاں کبھی صدقے
تم اپنا بنا لوگی تو کیا کیا نہ کریں گے!

گستاخ نگاہوں سے اگر تم کو گلہ ہے
ہم دور سے بھی اب تمہیں دیکھا نہ کریں گے
اختر یہ گھٹائیں، یہ ہوائیں، یہ فضائیں!
توبہ کریں اس حال میں توبہ نہ کریں گے

غزل

(۱۰)

اے دل وہ عاشقی کے فسانے کدھر گئے؟
وہ عمر کیا ہوئی، وہ زمانے کدھر گئے؟
ویراں ہیں صحن و باغ بہار دل کو کیا ہوا
وہ بلبلیں کہاں وہ ترانے کدھر گئے؟
تھے وہ بھی کیا زمانے کہ رہتے تھے ساتھ ہم
وہ دن کہاں ہیں اب وہ زمانے کدھر گئے؟
ہے نجد میں سکوت، ہواؤں کو کیا ہوا؟
لیلائیں ہیں خموش دوانے کدھر گئے؟
صحرا و کوہ سے نہیں اٹھتی صدائے درد
وہ قیس و کوہ کن کے ٹھکانے کدھر گئے؟

وہ چاندنی چھلکتی ہوئی چشمہ سار میں
وہ راتیں اور سمے وہ سہانے کدھر گئے؟

اُجڑے پڑے ہیں دشتِ غزالوں پہ کیا بنی
سُونے ہیں کوہسار وہ دانے کدھر گئے؟

وہ ہجر میں وصال کی امید کیا ہوئی
وہ رنج میں خوشی کے بہانے کدھر گئے؟

غیروں سے تو امیدِ وفا پہلے ہی نہ تھی
روتا یہ ہے کہ اپنے یگانے کدھر گئے؟

دن رات میکدے میں گزرتی تھی زندگی
اختر وہ بے خودی کے زمانے کدھر گئے؟

غزل

(۱۱)

جب سے دیکھا ہے ترا روئے بہار آلودہ
چشمِ ہستی نظر آتی ہے خمار آلودہ

رنگ لایا ہے کسی بلبلِ دیوانہ کا خون
سرخیٔ گُل سے ہے دامانِ بہار آلودہ

یاس و حسرت کا سماں کیوں ہے فضا پر طاری
غم سے ہے کیوں چمن بلبل و بہار آلودہ
رہ گئے رنگیں یہ پریشاں ہیں سنہری زلفیں
جیسے ہو اک گل شاداب، غبار آلودہ
شمع امید کی کرنیں ہیں پریشاں اختر
دل کا آئینہ کچھ ایسا ہے غبار آلودہ

غزل

(۱۲)

در ازل، چوں شمع بیابان بے قرارم دادہ اند
سینۂ پر سوز و چشم لالہ کارم دادہ اند
قسمتم کردند عشق و سوز و ساز و درد و غم
ویں ہمہ آشوبہا مستانہ وارم دادہ اند
زاہدا با من تمی سازد، طریق زہد تو
درکف مستی عنان اختیارم دادہ اند
گریہ ہائے بے خودی را منع بے تابی حرام!
بار گب مژگاں، دگیا ایں بسیارم دادہ اند

چوں نہ گریم ہمچو ابر و چوں نہ خندم ہمچو برق۔
با محبت، فطرتِ دیوانہ کارم دادہ اند!

کس نمی داند کہ راہِ منزلِ سلمیٰ کجاست
ایں قدر دانم کہ دردِ انتظارم دادہ اند

جز سرشکِ شوق و سوزِ جاں و آہِ صبح نیست
آنچہ اختر در ازل بے اختیارم دادہ اند

غزل

(۱۳)

وہ فتنہ کار، زیبِ شبستاں ہے آج کل
کیوں محوِ خوابِ شورشِ دوراں ہے آج کل

ہے خوفِ محتسب بھی، خیالِ حساب بھی
لاہور گرچہ جنتِ رنداں ہے آج کل

دنیا نے گو جلا کے ہمیں خاک کر دیا
پھر بھی دماغِ عشق، گلستاں ہے آج کل!

پھر عقدۂ حیات و فنا، زیرِ غور ہے
پھر زیبِ دوش گیسوئے پیچاں ہے آج کل!

پھر ہنس رہی ہے ساری خدائی مرے لیے
پھر سامنے وہ چہرۂ خنداں ہے آج کل

پھر ابر چھا رہا ہے بہاریں لیے ہوئے
پھر سامنے وہ زلفِ پریشاں ہے آج کل!

فصلِ بہار و روئے نگار و مے کہن
حاصل ہر ایک طرح کا ساماں ہے آج کل

کہہ دو سحر سے ہم کو نہیں فرصتِ نظر
مصروفِ حسن و رنگِ شبستاں ہے آج کل

ایماں کو عزیز رکھیں ہم تو کس طرح
پیشِ نظر وہ غارتِ ایماں ہے آج کل

بھولا نہیں سبق ابھی دیرینہ عشق کا
اختر کو گرچہ شکوۂ دوراں ہے آج کل

غزل

(۱۴۲)

اے دل آ، اپنے دل آزار کو پھر یاد کریں!
بھولنے والے جفا کار کو پھر یاد کریں!

ایک ایک پھول کو آنکھوں سے لگا کر روئیں
اس بہارِ گُل و گلزار کو پھر یاد کریں!
دیدۂ نرگسِ بیمار کو کر دیں پُرآب
ساغرِ دیدۂ سرشار کو پھر یاد کریں
چاند کی کرنوں میں اشکوں کے پرو دیں موتی
اپنے اس آئینۂ رخسار کو پھر یاد کریں
چشمِ مینا سے اُبلنے لگیں اشکِ حسرت
اثرِ مستیٔ رفتار کو پھر یاد کریں

غزل

(۱۵)

پھر وہی شہر، وہی کوئے بتاں سامنے ہے!
پھر وہی دیر، وہی بزمِ مغاں سامنے ہے!
پھر وہی مست بہاریں ہیں مری راتوں پہ
پھر اسی طرح سقفِ گنبدِ ناں سامنے ہے!
پھر مری غمزدہ آنکھوں میں خوشی ہے رقصاں
پھر مرا گم شدہ رویائے جواں سامنے ہے!

پھر مرے لب پہ ہیں اشعارِ رواں حافظ کے
پھر کوئی نغمۂ شاداب و جواں سامنے ہے!
پھر فسوں کار ہے اک میکدۂ ابر بدوش
پھر کوئی دیدۂ افسانہ چکاں سامنے ہے!

غزل

(۱۶)

خدا کو نہ بھولے کہ دُنیا نہ بھُولے
ترے عشق میں آہ کیا کیا نہ بھُولے
صبا میری حورِ قصوری سے کہنا
قصور آپ کا دل سے بھولا نہ بھُولے
تمہاری تمنا میں عمریں گنوا دیں
مگر ہم تمہاری تمنا نہ بھُولے

غزل

(۱۷)

چمن بھی ہے، ابر بھی، ہوا بھی، شراب بھی، سبزہ زار بھی ہے!
الٰہی توبہ کی خیر آغوش میں وہ جانِ بہار بھی ہے!

یہ آنکھوں آنکھوں میں تو نے ساقی، خبر نہیں کچھ، پلا دیا کیا
ہیں اس نشیلی نظر کے صدقے کچھ اس نشے کا اتار بھی ہے!
نہ جانے مجھ سے خطا ہوئی کیا کہ پھر نہ جام شراب بخشا
نگاہ ساقی کو یوں تو میرا یقین بھی اعتبار بھی ہے
بجا کہ اس بے وفا کے در پہ کبھی نہ جائینگے آپ اختر
خطا معاف، آپ یہ تو کہیئے کہ دل پہ کچھ اختیار بھی ہے؟

غزل

(۱۸)

لاکھ بہلائیں طبیعت کو بہلتی ہی نہیں
دل میں اک پھانس چبھی ہے کہ نکلتی ہی نہیں
قاعدہ ہے کہ جو گرتا ہے سنبھل جاتا ہے
دل کی حالت وہ گری ہے کہ سنبھلتی ہی نہیں
رنگ کیا کیا فلک پیر نے بدلے لیکن
میری تقدیر، کہ یہ رنگ بدلتی ہی نہیں
کس کو کہتے ہیں محبت نہیں معلوم مگر
اک تمنا سی ہے جو دل سے نکلتی ہی نہیں

غزل

(۱۹)

آئینہ خانہ میں اُن کے حسن کے جوہر کھلے
در کے کھلتے ہی ہزاروں جنتوں کے در کھلے

شام کو یہ کون سرمستِ پرستشِ نازنیں
شمع ٹھکرا کے چاہتی ہے بتکدے کا در کھلے

بن رہی ہے آج تک وہ حورِ تصویرِ حیا
دیکھئے کب تک کھلے، کیسے کھلے، کیونکر کھلے

بادۂ گلرنگِ ساقی میں عجب تاثیر تھی
میکدے میں عقدہ ہائے مومن و کافر کھلے

غزل

(۲۰)

ہزار ضبط کروں، زار زار روتا ہوں
کسی کی یاد میں بے اختیار روتا ہوں

مثالِ برقِ فروزاں جنوں میں ہنستا ہوں
برنگِ دیدۂ ابرِ بہار روتا ہوں

کسی کی یاد میں آنسو بہائے تھے نہ کبھی
میں آج کیوں مرے پروردگار روتا ہوں
مآلِ بزمِ شبانہ کا داغ ہے دل پر
چراغِ صبح ہوں، بے اختیار روتا ہوں

غزل

(۲۱)

اب ناصحِ ناداں کے سمجھانے کو کیا کہیئے
دیوانہ ہے دیوانہ، دیوانے کو کیا کہیئے
دو چاند ہیں پہلو میں اب چاند کہیں کس کو
ساقی کو اگر کہیئے، پیمانے کو کیا کہیئے
آدابِ محبت سے تھا دور ترا شکوہ
ایامِ جدائی کے افسانے کو کیا کہیئے
ہر جنبشِ مژگاں میں سو عرش چھپے نکلے
اب کعبے کو کیا لکھیئے، بتخانے کو کیا کہیئے

غزل

(۳۲)

وہ مرے دل کا حال کیا جانے
سوزِ رنج و ملال کیا جانے

ہر قدم فتنہ ہے قیامت ہے
آسماں تیری چال کیا جانے

صبر کو سب کمال کہتے ہیں
عاشقی یہ کمال کیا جانے

خون ہوتا ہے کس کی حسرت کا
میرا رنگیں جمال کیا جانے

وہ غریبوں کا حال کیوں پوچھے
وہ غریبوں کا حال کیا جانے

کھو گیا ہو جو دل تصور میں
وہ فراق و وصال کیا جانے

سیلِ خوں کیوں رواں ہے آنکھوں سے
موسمِ برشگال کیا جانے

مر رہے ہیں فراق میں اختر
وہ مگر اپنا حال کیا جانے

غزل

(۲۳)

پھر فصلِ بہار آ رہی ہے — اور پھول نئے کھلا رہی ہے
نغمہ سا صبا سنا رہی ہے — ہر ایک کا دل لبھا رہی ہے
خوشبوئیں ہیں چار سو پریشاں — پھولوں کو ہوا جگا رہی ہے
جو پھول ہے مسکرا رہا ہے — جو شاخ ہے لہلہا رہی ہے
ہے اودی گھٹا کہ حورِ فطرت — گلزار کا منہ دھلا رہی ہے
بوندوں کے یہ مست مست اشارے — گویا کہ گھٹا بلا رہی ہے
بدلی ہے کہ نیلی پوش ساقی — جامِ کوثر پلا رہی ہے
ساقیٔ بہار جامِ گل سے — رنگیں بادہ پلا رہی ہے
پھر حورِ نسیمِ صبح گاہی — ہر غنچے کو گدگدا رہی ہے
اور بربطِ شاخسارِ گل پر — اک سازِ حسیں بجا رہی ہے

اختر چلو ہر گلی کوچے میں
دل میں یہ دھن سما رہی ہے

غزل

(۲۴)

پچھلی رات "دورۂ جنوں" کے عالم میں کعبے کی مخالف سمت سے آواز آئی کہ غزل کہو اور میں گاتی ہوں۔ میں نے کہا تم گاؤ اور مجھے لکھاتی جاؤ۔ چنانچہ جو کچھ اُس نے لکھوایا میں لکھتا گیا۔ اور وہ بغیر اصلاح و نظر ثانی نذرِ قارئین ہے۔

اختر

گھنگھور گھٹا گر صبح کو ہو، کیا وقت سہانے ملتے ہیں
اس طرح کہ جیسے بچھڑے ہوئے دو مست دوانے ملتے ہیں

ہے آج فضا بھی غمگیں سی، ہے آج صبا بھی محزوں سی
کیا بات ہے یہ کیوں درد بھرے غمناک فسانے ملتے ہیں

کس نے یہ کہا، کس سے یہ سُنا، یوں کہنے کو ہر اک کہتا ہے
انصاف تو ہو سلمیٰ سے کہیں، لیلےٰ کے فسانے ملتے ہیں

ہم کو تو جوانی میں بھی کوئی اک منظرِ سادہ تک نہ ملا
سنتے تھے کہ اس دنیا میں کبھی، نظارے سہانے ملتے ہیں

یہ بات الگ ہے آئے کوئی! آئے تو اپنا ہو کے رہے
یوں ورنہ کسی کو شام و سحر، ہر روز بہانے ملتے ہیں

بدبختی اُلفت یہ بھی ہے ، اچھا تو زمانہ مل نہ سکا
کہتے ہیں کہ شوقِ اُلفت میں اچھے بھی زمانے ملتے ہیں
بلبل کے ترانے کیوں نہ پسند آئیں ہیں درد فرقت میں
غمگیں دلوں کو غم ہو اگر ، غمگین ترانے سنتے ہیں
اختر جسے دُنیا کہتی ہے ، افسردہ سا ہے ، بیمار سا ہے
کیا ایسی مکدّر دُنیا میں ، ایسے بھی دوانے ملتے ہیں !

سانیٹ

پیمانِ وفا

یہ کیا کہا، کہ تمہیں دل سے میں بھلا دوں گا
تمہاری یاد مجھے بھول کر نہ آئے گی
یہ بے رخی میری تم کو بہت رلائے گی!
کہ نقش مہر و وفا دل سے میں مٹا دوں گا

یہ کیا کہا کہ کہیں اور دل لگا لوں گا!
دیارِ غیر میں یاد آئے گی نہ گھر کی مجھے
نہ شرم ہوگی کچھ ان دیدہ ہائے تر کی مجھے
کہ اپنے سینے میں، ہیں اور کو بسا لونگا!

یہ کیا کہا، کہ کروں گا، نہ اب میں یاد تمہیں
تمہارے روئے نگاریں کو بھول جاؤں گا!
تمہارے حسن بہاریں کو بھول جاؤں گا!
نہ رکھ سکوں گا ہمیشہ کی طرح شاد تمہیں

بہ رب کعبہ نہ بھولوں گا میں کہیں تم کو
ہر ایک ذرّے میں پائے گی یہ جبیں تم کو

بیوی سے

کیا کہا "آپ تو پردیس میں آرام سے ہیں
"آپ کی جان سے دُور، آپ پریشاں کیوں ہوں"
"ہم غریبوں کی طرح مضطر و گریاں کیوں ہوں"
"مطمئن آپ تو ہر فکر، ہر الجھن سے ہیں"
لیکن اے جانِ وفا، کچھ تجھے معلوم بھی ہے؟
تیری زلفوں کی طرح، کتنا پریشاں ہوں میں
ابر کی طرح تری یاد میں گریاں ہوں میں!
"مطمئن" کہتی ہے تو جس کو وہ مغموم بھی ہے
لیکن اتنا ہے کہ تجھ سے نہیں کہتا غمِ دل!
شعلۂ درد کو سینے میں دبا رکھا ہے!
قلزمِ اشک کو آنکھوں میں چھپا رکھا ہے!
ورنہ اس حال میں خاموش نہ رہتا غمِ دل!
تجھ سے کہہ دوں تو ترے دل پہ بلا آتا ہے!
آبگینے کی نزاکت کا خیال آتا ہے!!

تسلّیاں

نہ رو، نہ رو کہ چمن کی بہار ختم ہوئی

فضائے باغ میں چلنا صبا نے چھوڑ دیا
کلی کلی پہ مچلنا صبا نے چھوڑ دیا
کہ فصلِ خندۂ گل و خوشگوار ختم ہوئی

نہ رو، نہ رو کہ مری لالہ رُخ وطن سے گئی

وہ رات دن کی ملاقات اب سے خواب ہوئی
وہ پیار، پیار کی ہر بات اب سے خواب ہوئی
بہ رنگِ گُل، وہ مری گلبدن چمن سے گئی

نہ رو، نہ رو کہ بس اب دورِ جام رخصت ہے!

خزاں نصیب ہوئیں وہ شباب کی راتیں
نہ آئیں گی پھر ماہتاب کی راتیں
کہ موسمِ قدحِ لعل فام رخصت ہے!

دلِ حزیں، یہی ایام پھر بھی آئیں گے
بہار و لالہ رُخ و جام پھر بھی آئیں گے

لذّتِ خاموش

شامِ گلشن پہ بہاروں کے سمے لہرائے!
نگہہِ شوق ہے اور مست نظاروں کا ہجوم!
شفق و نور کی شاداب بہاروں کا ہجوم!
مسکراتے ہوئے تاروں کے سمے لہرائے!

ہر طرف رقص کناں غالیہ زاروں کا سکوت
محفلِ دہر پہ خوابوں کا سماں طاری ہے
ذرے ذرے پہ کوئی حُسن جواں طاری ہے
دلِ آفاق پہ چھایا ہے بہاروں کا سکوت!

کون آیا میرے سینے میں بہ مخمور جمال
کس کی آواز سے سرشار ہے دنیائے شباب
کس کی آنکھوں سے چھلکتی ہے یہ صہبائے شباب
بزم کونین ہوئی جاتی ہے مسحور جمال!

ایسے عالم میں ہوں دنیا کا نہیں ہوش مجھے
کر رہا ہے یہ اثر بے خود و خاموش مجھے

تاثیر

میں نے اک نغمہ سُنایا تھا تری محفل میں
ایسی حالت میں کہ تھا سازِ شکستہ میرا
یعنی تارِ نفس، آوازِ شکستہ میرا!
دل کا خون آنکھ میں تھا، آنکھ کے آنسو دل میں
میں نے دیکھا کہ ترے دل پہ اثر تک نہ ہُوا

میری فریادِ حزیں، خوابِ پریشاں ہی رہی
دل میں امیدِ جو تھی، یاسِ بداماں ہی رہی
رحم کا تیری نگاہوں میں گزر تک نہ ہُوا!
ساز کو پھینک دیا، با دلِ غمگیں میں نے

اس کے تارِ دل سے نے کبھی پھر نہ سنائے نغمے
ناامیدی سے کبھی لب پہ نہ آئے نغمے
گرچہ کتنے ہی لکھے نغمۂ خونیں میں نے

آج حیرت، مگر اے جاں مجھے اس راز پہ ہے!
اپنی آواز کا دھوکا، تیری آواز پہ ہے!

مہاجر

سکوں نصیب نہیں میری جانِ بسمل کو
فضائے غم میں مرے قلب کو قرار نہیں
کوئی امید نہیں ہے کہ سوگوار نہیں
وہ گم شدہ ہوں، ترستا رہے جو منزل کو!

دیارِ غیر میں روئے نشاطِ محفل کو
وہ شاخِ خشک جو محمورِ برگ و بار نہیں
فسردہ گُل، جسے اُمیدِ نو بہار نہیں
الٰہی! کیا کروں اپنے الم زدہ دل کو

چمن سے دور ہوں اک بلبلِ حزین و خموش
ستا رہی ہو جسے یاد آشیانے کی
فلک نے چھین لی جس سے خوشی زمانے کی
گُلوں سے دور ہوں میں اک گُلِ حزین و خموش

ہوائے خلد ہو دل میں تو خار بھی نہ ملے
جو مر رہوں تو کنارِ مزار بھی نہ ملے

اذاں

روحِ آفاق میں جس کو شرر افشاں دیکھا

وہ صدا، جس کو دل و جانِ مسلماں کہیے

نغمۂ بے خودی، رحمتِ گہہ یزداں کہیے!!

سینۂ دہر میں ہر سو، جسے رقصاں دیکھا!

روز و شب اور مہ و سال گئے، پھر آئے

اس کا مستانہ تلاطم ہے ابھی تک برپا

لبِ فطرت کا تبسم ہے ابھی تک برپا

کتنے ماضی مٹے اور حال گئے، پھر آئے!

دشت و صحرا و جبل، جس سے دہل جاتے ہیں

جس سے ہیں لرزہ بر اندام شوالے اب بھی

جس سے کانپ اٹھتے ہیں دنیا کے تظالے اب بھی

لات و عزّیٰ و ہبل، جس سے دہل جاتے ہیں!

یہ اذاں ہے کہ ہے اک عظمتِ سرشار و جواں!

قلبِ مسلم کی ہے اک دولتِ بیدار و جواں!

رہٹ کی آواز سُن کر

عمرِ رفتہ کی صدا آتی ہے آواز کے ساتھ
آہ یہ نغمۂ بے تاب و حزیں کیسا ہے؟
وقت کی آنکھ میں یہ خوابِ حسیں کیسا ہے؟
جیسے مضراب شکستہ ہو کسی ساز کے ساتھ!

آہ یہ بچے، یہ معصوم، یہ ناداں روحیں!
جیسے آواز کی جنت میں ہوں تارے روشن!
شفقِ شام میں پھولوں کے ستارے روشن!
جانفزا کھیت میں دہقاں کی دہقاں روحیں

کوئی دھیمی سی نوا ہے کسی آہنگ کے بعد
کوئی شیریں سی ادا ہے جو ستاتی ہے مجھے!
عالمِ خلد کا افسانہ سناتی ہے مجھے!
جیسے روتی ہوئی آنکھیں ہوں کسی جنگ کے بعد

اپنی ہر آہ کے ہمراہ تو رونے دے مجھے
رحم کر اپنی اس آواز میں کھونے دے مجھے

شربتی آنکھیں

شربتی آنکھوں سے اک جام پلا دے مجھ کو!
آہ وہ جام کہ شبنم بھی ہے مسموم بھی ہے
سادہ بھی مست بھی، رنگین بھی معصوم بھی ہے
پھر اسی جام سے دیوانہ بنا دے مجھ کو

تیرے شربت میں نہاں مستیٔ گلہائے بہار
تیری آنکھوں میں ہیں ساون کے ستارے روشن
شفق و نور کے شاداب نظارے روشن
آہ اے رشکِ نکہت و سلمہائے بہار

تیری مستی بھری آنکھیں ہیں کہ جامِ گویا
جنتِ قدس کا افسانہ سناتے ہیں مجھے
جنتِ کیف کا نظارہ دکھاتے ہیں مجھے
صبح ناطق کھول میں ان کو کہ جامِ گویا

اس طرح دیکھ کہ پھر ہوش نہ آنے پائے
میری آنکھوں میں کبھی کچھ نہ سمانے پائے

راحتِ رفتہ

تجھے کیوں راحتِ رفتہ کی یاد آتی ہے رہ رہ کر؟
مرے نادان دل کچھ تو بتا یہ ماجرا کیا ہے؟
پرانے قصّے دہرانے سے آخر فائدہ کیا ہے؟
بتا ماضی کی دُھن کیوں اتنا تڑپاتی ہے رہ رہ کر؟

کسی کا حال دُنیا میں کبھی یکساں نہیں رہتا
زمانے میں تغیّر ہی تغیّر کی حکومت ہے
تغیّر اصلِ ہستی ہے، تغیّر اصلِ فطرت ہے
تغیّر ہو نہ جس انساں میں، وہ انساں نہیں رہتا!

خزاں کے بعد آتی ہیں بہاریں باغِ عالم میں!
بہاریں ختم ہونے پر خزاں کا دور آتا ہے
چمن روتا ہے اک دن دوسرے دن مُسکراتا ہے
غرض عمریں گزر جاتی ہیں، یوں شادیٔ و ماتم میں!

بُلا کر راحتِ رفتہ کو لا سکتا نہیں اے دل!
تو اپنے رنج کو راحت بنا سکتا نہیں اے دل!

صبح تک

جلوۂ قدس، سرِ بزمِ حسیں طاری ہے!
چارسُو بال فشاں، عصمت و عفت کی مہک
جس پہ ہوتی ہے فدا وادیٔ جنت کی مہک
کہکشاں، محوِ ضیا باری و گل باری ہے!

آہ یہ رات، یہ موسم، یہ ستاروں کی بہار
جمع ہیں ایک طرف چند خواتینِ حسیں
گلشنِ عفت و حرمت کی ریاحینِ حسیں
وہ ریاحیں کہ جنہیں کہئے بہاروں کی بہار

پھیلی ہے چار طرف نکہتِ گلہائے نیاز
پارسائی کی بہاروں کا سماں چھایا ہے
وہ سماں جس کا کہ فردوس بریں سایہ ہے
ہائے یہ جلوۂ معصوم یہ سیمائے نیاز

امتحاں اپنے تقدس کا ہے مقصود ان کا
وہ تقدس کہ دل و جاں سے ہے مسجود ان کا

سالگرہ

فضائے شام غریباں میں آئی سالگرہ

یہ انقلاب لکھا تھا نصیبِ عصمت میں
کٹے یہ لمحۂ مسرور، رنجِ غربت میں
خدا نے دہلی سے باہر دکھائی سالگرہ

زمانہ سخت دل آزار و بے وفا نکلا

ہر اک کے حصے میں دنیا کی سختیاں آئیں
بقدرِ حوصلہ یہ تیرہ بختیاں آئیں
نگوں نصیب جو دل تھا ستم زدہ نکلا

جنہیں نصیب تھا گھر بار، آج بے گھر ہیں

جو خوش تھے اپنے وطن میں وہ بے وطن ہیں آج
جو شادماں تھے، رہینِ غم و محن ہیں آج
رہینِ جورِ سپہرِ فساد پرور ہیں!!

زبانِ شکر پہ ہر وقت حمدِ باری ہے
اس انقلاب پہ بھی گریہ ہے نہ زاری ہے

فکاہات

مردِ اور عورت کی یکرنگی

عورتوں کے مردانہ فیشن پر طنز یہ

(۱)

ذوقِ ہمرنگی

کل شب کو تھیں اک بال میں، جلوہ کناں حور و پری
یا محورِ رقص و نغمہ تھے، صد ہا بتانِ آذری!

دل موہ لینے کے لیے، ہر شوخ ادا آمادہ تھی
آنکھوں میں کفرِ ساحری، ہونٹوں پہ کفرِ ساحری!

تہذیبِ نو کے رنگ سے، لبریز تھی ہر اک ادا
ملبوس کی عریانیاں، انداز کی عریاں گری!

تھے زلف و گیسو کی جگہ، مردانہ فیشن سر کے بال
وہ تھیں کہ صد ہا مہ جبیں، مستِ شرابِ دلبری!

یہ دیکھ کہ میں نے کہا اک شوخ "صبر آشوب سے"
"اے چہرۂ زیبا ئے تو رشکِ بتانِ آذری"!
یوں تو مکمل ہے ترا، ہر طرح حسن بے مثال!
"ہر چند وصفت می کنم، در حسن ازاں زیبا تری"!
لیکن ز راہِ لطف مجھ کو دے جواب اس بات کا
کیونکہ گوارا ہے تجھے، یہ گیسوؤں کی ابتری
پہلے تو سوچا دیر تک، پھر مسکرا کر ناز سے
یوں بولی وہ کافر ادا، مستادلئے کافری!
مردانہ فیشن سے غرض اس کے سوا کوئی نہیں
"تا کس نہ گوید بعد ازیں، من دیگرم تو دیگری"

(۴)

شاعروں کا دامِ گیسو!

ہمارے شاعروں کو رات دن بیتاب رکھتی تھی
تمنّا، خود کو دامِ زلف و گیسو میں پھنسانے کی
مگر اب سُنتے ہیں گیسو بُری کا چل پڑا فیشن
بڑھائیں جا کے یہ حضرات رونق جیل خانے کی

(۳)

انقلابِ معنی

لغاتِ خانہ میں گیسو بُریدہ ایک گالی تھی
مگر گیسو بُریدہ، آج کل ہر ایک عورت ہے
فقط گیسو بُری کا ذکر کیا ہے اِس زمانے میں
کہ عریانیٔ تن بھی داخلِ تقلیدِ فطرت ہے

(۴)

لطافتِ تمثیل

مغرب کی نعمتیں یوں، مشرق میں بٹ رہی ہیں
چہرے چمک رہے ہیں، اور زلفیں کٹ رہی ہیں
ہے حُسن زارِ نسواں، میں انقلاب برپا
دن بڑھ رہے ہیں اختر، اور راتیں گھٹ رہی ہیں

اے کشتۂ فولاد

اس نظم کے شانِ نزول کے اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک مرتبہ میں شملے جانے کا اتفاق ہوا۔ جن دوست کی کوٹھی پر بایدوقت منزل اجلال فرما تھے ان کے صاحبزادے کو ایک بزرگوار کہ نام جن کا امول الرشید ہارونی تھا۔ ریاضی اور تاریخ پڑھانے پر مامور تھے۔ ملازمین عام طور پر ازراہِ عقیدت ان کو "خلیفہ" صاحب کہہ کر پکارتے تھے گو یہ امر ہنوز بدستور ایک راز بنا ہوا ہے کہ ان خلیفہ صاحب کا کوئی نسلی یا بیعتی تعلق خاندانِ عباسی کے خاندان سے تھا یا نہیں، بہر حال قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ از بسکہ ہمارے خلیفہ صاحب "کشتگانِ خنجرِ تسلیم" امراض سے تھے۔ اور ...... ہر زماں از غیب جانِ دیگر است، کی زندہ مثال بنے رہنا چاہتے تھے۔ اس لیے آپ کو کشتوں اور خاص طور پر "کشتۂ فولاد" کی چاٹ پڑ گئی تھی۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ خلیفہ صاحب عباسی ہونے کے بجائے شاید کشتگانِ "محبوبِ صلیبی" کی اولاد ہوں۔

الغرض ان کی کشتہ خوری کی "فولادی" عادت کو ملحوظ رکھتے ہوئے بہ نگاہِ قدر شناسی ہم نے ان کی خدمت میں "کشتۂ فولاد" کا خطاب پیش کر دیا۔ اور چونکہ رسم خطاب یافتگی سے ایک روز پہلے وہ ہم سے وعدہ خلافی کر کے تنہا سیر کو چلے گئے تھے۔ اس لیے ہم نے اس پیش کش کے ساتھ بطور "مستزاد" چند اشعار بھی تقدیم کرنے مناسب سمجھے۔

کل چھوڑ کے تنہا تو ہمیں چل دیا اُستاد!
اے کشتۂ فولاد!
کیا راہ میں ملنی تھی کوئی طرفہ پری زاد؟[1]
اے کشتۂ فولاد!
دنیا تجھے کہتی ہے فلاطون کا بیٹا
ھارون[2] کا بیٹا
مامون ترا نام ہے، اے صاحبِ اولاد!
اے کشتۂ فولاد!

---

[1] خلیفہ صاحب کے ایک خاص مرض کی طرف اشارہ ہے۔
[2] خلیفہ صاحب کے مورث اعلیٰ کا نام تھا۔

ہر سُو نظر آتی ہیں دواؤں کی قطاریں
کُشتوں کی بہاریں

کمرہ ہے سراپا ہے شفاخانہ سا آباد
اے کُشتۂ فولاد

اک گاؤں کا کھانا تو اُڑا جاتا ہے تنہا
کھا جاتا ہے تنہا

معدہ ترا کرتا ہے سدا درد سے فریاد
اے کُشتۂ فولاد

ہر وقت شکایت ہے تجھے دردِ جگر کی
اور ضعفِ بصر کی

کُشتہ ہو کہ سُرمہ ہو ترے دم سے ہے آباد
اے کُشتۂ فولاد

کُشتوں کے سوا تجھ کو کوئی دھیان نہیں ہے
ارمان نہیں ہے

دنیا کے اطبا کے مطب تجھ سے ہیں آباد
اے کُشتۂ فولاد

دُنیا تجھے کہتی ہے محبّت سے خلیفہ!
اے رشکِ "خلیفہ"!

روتے ہیں جدائی میں تری دجلہ[1] و بغداد
اے کشتۂ فولاد!

وہ باج و خراج اور ترا تاج کہاں ہے؟
وہ راج کہاں ہے؟

کی گنبدِ گردوں نے "خلافت" تری برباد[2]
اے کشتۂ فولاد!

اگلی سی تری عظمت و شوکت نہیں باقی
سطوت نہیں باقی

اب نائی ہی کہتے ہیں "خلیفہ" تجھے اُستاد
اے کشتۂ فولاد!

ہے پیٹ ترا یا کوئی پنساری کی دکاں
عطاری کی دکاں!

---

۱ نام کے اثر سے خلیفہ صاحب اپنے آپ کو عراقِ عرب اور مصر کا جائز وارث خیال کرتے تھے۔ ۲ ہم سے ملاقات کے وقت خلیفہ صاحب برہنہ حالوں میں تھے۔

آنتیں ہیں تری یا کہ دواخانہ ہے آباد
اے کُشتۂ فولاد!

سیروں ہی اڑا جاتا ہے شبرات کا حلوا
خیرات کا حلوا
تاثیر سے کُشتوں کی ہوا تجھ کو یہ گرِ یاد
اے کُشتۂ فولاد!

کُشتوں کا کچھ اس طرح تجھے روگ لگا ہے
گویا کہ ہوا ہے
دُنیا کا ہر اک کُشتہ ترے واسطے ایجاد
اے کُشتۂ فولاد!

ہر وقت تجھے صرف دوا پینے کی ہے فکر
اور جینے کی ہے فکر
گو تیرا جگر موت کو آتا ہے بہت یاد
اے کُشتۂ فولاد!

کھیلے تو اگر تاش تو بازی ہی الٹ جائے
قسمت ہی پلٹ جائے

ہر کھیل میں رہتی ہے نحوست تری ہمزاد

اے کشتۂ فولاد!

غش کھا کے گریں دیکھ کے تو اتنا حسیں ہے

ہر اک کو یقیں ہے

کھینچیں تری تصویر اگر مانی و بہزاد

اے کشتۂ فولاد!

ہر موجِ صبا ہے تری رفتار کے صدقے

گفتار کے صدقے

ہے نکہتِ گلزار ترے عشق میں برباد

اے کشتۂ فولاد

لکھے تری تعریف میں کیا ابن بطوطہ

چل جائے نہ جوتہ

تاریخ میں گو دن ہے ریاضی میں تو اُستاد

اے کشتۂ فولاد!

مطائبہ

پوسٹ مین اُس بُت کا خط لاتا نہیں
اور جو لاتا ہے پڑھا جاتا نہیں

کون سائنٹ ہے جو تڑپاتا نہیں
مال یہ ہم سے پھیرا جاتا نہیں

عاشقی سے کیوں ہم استعفا نہ دیں
ہوٹلوں کا بل دیا جاتا نہیں !

شیخ جی موٹر پہ حج کو جائیے
عہدِ نو میں اونٹ کام آتا نہیں

بوسہ لیں اُس سرو قد کا کس طرح
تاڑ پہ ہم سے چڑھا جاتا نہیں

پھیر لیں کیوں دل نہ اس ظالم سے ہم
عشق ہے رشتہ نہیں ، ناتا نہیں

عاشقوں پر ظلم کرنا چھوڑ دیں
کیوں بے قاصد جا کے سمجھاتا نہیں!

رات دن فرمائشیں زیور کی ہیں
ہم سے اب عاشق رہا جاتا نہیں

بزم میں دشمن ہے کیوں خاموش آج
بھائی چھیلا رس پیے گاتا نہیں

جل گئی سگریٹ سے داڑھی شیخ کی
یہ مگر فیشن سے باز آتا نہیں

فربہی کا طنز کیوں عشاق پر
تیری چکّی سے تو پسواتا نہیں!

فیس پہلے جب تلک رکھوا نہ لے
ڈاکٹر اپنے بھی گھر جاتا نہیں

سب کہتی ہیں نوکری کرنی پڑی
وہ سوائے کیک کچھ کھاتا نہیں

تیری فرقت میں بہت فاقے کیے
آ کہ اب بھوکا رہا جاتا نہیں!

گھس کھد سے گھسنے لگے ہیں ٹاکیاں
دیسی فلموں میں مزا آتا نہیں!

کب سے ہے مہمان تو اسے ہجر یار؟
بھائی میرے گھر سے کیوں جاتا نہیں؟

اف ستمگر! رو کتنا موڑ ذرا
میرے خنجر سے چلا جاتا نہیں

لانڈری کھولی تھی اس کے عشق میں
پر وہ کپڑے ہم سے دھلواتا نہیں

حضرت ابن بطوطہ[۱] کی غزل
ضد کے مارے وہ ترنم گاتا نہیں

---

۱ حضرت اختر شیرانی ذکا ہی نظموں میں بالعموم اپنے آپ کو ابن بطوطہ لکھتے تھے

سوالات

وہ جب کبھی یاد آتے ہیں

(۱)

وہ جب کبھی یاد آتے ہیں!
کیوں چھیڑتے ہیں مجھ کو، کیوں مجھ کو ستاتے ہیں؟
چُپ چُپ سے وہ رہ رہ کر
کچھ آنکھوں میں کہہ کہہ کر، کیوں مجھ کو ہنساتے ہیں؟
تنگ آئی ہوں عادت سے
ہر وقت شرارت سے، کیوں مجھ کو جلاتے ہیں؟
اظہارِ محبت سے
اقرارِ محبت سے، کیوں مجھ کو بناتے ہیں؟
جب ہوتی ہوں رنجیدہ،
تب ہو کے وہ سنجیدہ، کیوں مجھ کو مناتے ہیں؟
کرتی ہوں گلہ جب میں
ہوتی ہوں خفا جب میں، کیوں پیار جتاتے ہیں؟
وہ جب کبھی آتے ہیں

؟

(۲)

کیا دل میں سمائی ہے ؟
پردیس میں جا کر یوں، کیوں چھائونی چھائی ہے ؟
باغوں پہ گھٹا چھائی
کیوں ایسے سمے آئی، ساون کی دہائی ہے ؟
کب سے ہیں جدا ہم سے ؟
کب سے ہیں خفا ہم سے، کب سے یہ لڑائی ہے ؟
یہ تو نہیں کچھ مشکل !
خط لکھنے میں بھی اے دل، کیا کوئی برائی ہے ؟
کیا دل میں سمائی ہے ؟

یاد

(۳)

پھر یاد وہ آتے ہیں
ساون کے بھرے بادل، دل میرا دُکھاتے ہیں!
پھر بدلیاں چھاتی ہیں!
امیدیں ستاتی ہیں، ارمان رُلاتے ہیں!
جا کر کوئی سمجھائے!
کیوں اب بھی نہ گھر آئے، سب اپنے گھر آتے ہیں!
رہ رہ کے ہیں یاد آتے
وہ بھولے نہیں جاتے، ہم لاکھ بھلاتے ہیں!
کس طرح مٹے یہ غم؛
بیتے ہوئے دن ہمدم رہ رہ کے رُلاتے ہیں!
پھر یاد وہ آتے ہیں!

سوزِ ناتمام

سوزِ ناتمام

اس عنوان کے ماتحت ہم چیدہ چیدہ بعض اشعار اور مصرعے درج کرتے ہیں جو ہمیں ناتمام غزلوں اور نظموں کی صورت میں اختر کی بیاض سے ملے ہیں۔

سحر کے وقت یہ مژدہ لیے ابرِ بہار آیا
مبارک اے زمیں! پیغمبرِ گردوں وقار آیا

دلِ دیوانہ وہ دن آئے، وہ دن پھر آئے
میں ہوں آنکھیں ہوں مری، اور مزارِ خواجہ
خاکِ اجمیر ہے گہوارۂ شان و عظمت
اختر اس خاک میں روشن ہے وقارِ خواجہ

عشق کی دُنیا میں رسوا ہو چکے
ہم تو پامالِ تمنّا ہو چکے
اک زمانے کا تماشا ہو چکے
رحم کر اے عشق رسوا ہو چکے

تجھ کو کیا دیکھیں کہ تجھ کو دیکھ کر
ہم تو آپ اپنا تماشا ہو چکے

اے گیت ذرا مجھے سُلا دے اور خواب میں خلد کو دکھا دے
وہ خلد کہ جس میں حور ہے وہ وہ رشکِ چراغ طور ہے وہ
جس ماہ جبیں پہ جاں ہے قرباں جس پہ مہ و کہکشاں ہے قرباں

مرے ندیم مجھے لے چل اُن بہاروں میں
جہاں بہشتیں ہیں رقصاں بنفشہ زاروں میں
جہاں ہیں نغمہ سرا حوریں شاخساروں میں
جو اپنیاں سی پُر افشاں ہیں جوئباروں میں
مرے ندیم مجھے لے چل اُن بہاروں میں

پہلے ہی کب امید تھی تم شاد کرو گے معلوم تھا ہم کو یونہی برباد کرو گے
کہتے ہو نکل جاؤ نکل جائیں گے جس دن یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کرو گے!

خون کے آنسو

رگ رگ میں میٹھی میٹھی خلش سی سما گئی ‌ بے اختیار جب بھی تری یاد آ گئی
ابرِ بہار جب کبھی آیا رُلا گیا ‌ بادِ بہار آگ سی دل میں لگا گئی

میرے اظہارِ محبت پہ بہ اصرار کیا ‌ پہلے کس کس سے یہ اقرار کیا
عرض کی میں نے کہ دل نے مجھے ناچار کیا ‌ بولے کیوں تم نے نہ انکار کیا

میرے اقرارِ محبت پہ کسی نے یہ کہا ‌ پہلے کس کس سے کہا
آہ میں کیا کہوں کہتے ہوئے آتی ہے حیا ‌ مجھ سے کیا جرم ہوا

کیا ہوا میں نے اگر عشق کا اظہار کیا ‌ آپ سے پیار کیا
آپ نے کیوں مرے ارمانوں کو بیدار کیا ‌ دل کو سرشار کیا

نہ وہ رنگِ باغِ جہاں رہا، نہ وہ کیفِ عمرِ جواں رہا
نہ وہ ذوقِ بزمِ مغاں رہا نہ وہ شوقِ کوئے بتاں رہا
وہ نسیمِ صبحِ چمن نہیں وہ شمیمِ زلفِ سمن نہیں

وہ نشاطِ باغِ وطن نہیں وہ کہاں رہیں یہ کہاں رہا

دنیا ہے سیہ خانۂ غم شمع جلا دے   اُٹھ ساقیٔ مدہوش مجھے پیمانہ اُٹھا دے!
اُس لغزشِ مستانہ کا ارماں ہے ساقی   جو تیرے مچلتے ہوئے قدموں پہ گرا دے

یا یہ دل دکھاتا ہے یا وہ جی لبھاتا تھا   یہ بھی اک زمانہ ہے وہ بھی اک زمانہ تھا
مرگئے ہم آخر کو اس طرح بھی کیا جیتے   زندگی کا ہر لمحہ موت کا فسانہ تھا

اے گیت اُسے بتا دے جا کر   میرا غمِ دل سنا دے جا کر

یادِ شبِ وصال کو دل سے مرے بھلا بھی دے
یہ خلش آہ یہ خلش آ اور اسے مٹا بھی دے
ہستیٔ بے ثبات کو منہ نہ لگائیں ہم کبھی
کہتے ہیں جس کو موت وہ ہم کو کچھ آسرا بھی دے

شکوہ سنجِ غمِ پنہانی ہوں   غمزدہ اخترِ شیرانی ہوں
آپ بھولے تو نہ ہونگے مجھ کو   آپ کا اخترِ شیرانی ہوں

دنیائے آرزو کو نہ برباد کر کے جا　　یوں تو مجھے نہ مائلِ فریاد کر کے جا
اتنا ستم نہ اے ستم ایجاد کر کے جا

فتنۂ و شور ہے برپا یہ حرم میں کیسا　　جس نے میخانے کی دیوار ہلا دی ساقی

میرا ہر شعر ہے اختر مری زندہ تصویر　　دیکھنے والے نے ہر لفظ میں دیکھا ہے مجھے

کس نے پھر چھیڑ دیا ذکرِ دیارِ سلمیٰ　　لہلہانے لگی آنکھوں میں بہارِ سلمیٰ

جب سے بے پردہ ترا حسنِ جواں دیکھا ہے　　ہر طرف خلد کے جلوؤں کو رواں دیکھا ہے

دنیا کے رنج و عیش ہیں کس اعتبار کے　　دو دن خزاں کے ہوتے ہیں دو دن بہار کے

تم تو سوتی ہیں گنوا دو بھری برسات کی رات
اور یہاں آنکھوں میں کٹ جائے یہ جذبات کی رات

شبِ بہار میں کیوں نیند سے وہ چونک اٹھے　　مرے خیال نے شاید جگا دیا ہوگا

نسیمِ صبحِ بہار مجھ کو سنا رہی ہے پیام کس کا
الٰہی! رہ رہ کے آ رہا ہے مری زباں پر یہ نام کس کا

چمن میں بادۂ گل نے عجب دھوکہ دیا مجھ کو
کہ میں نے شوقِ مے نوشی میں کانٹوں پر زباں رکھ دی

سیلابِ اشک دیکھ کے حیرت ہے یہ ہمیں
کس طرح چھپ گئے ہیں یہ دریا حباب میں

کسی شوخ کی یاد آنے لگی ہے   محبت ہمیں پھر ستانے لگی ہے

کیوں صبا آئے ترے کوچے میں؟   پھرنے والی ہزار ہا گھر کی!!

دل نے بری طرح سے ستایا تمام رات   رویا خود اور ہمیں کبھی رُلایا تمام رات

میکدے میں اب بھی گر آتا ہے مے نوشی کی نیت   کیا خبر تھی اختر اتنا پارسا ہو جائیگا

بہت تڑپائیگی دل کو ہماری داستاں اک دن
کریگا یاد دورِ دہ گردشِ ہمیں سارا جہاں اک دن

شیر کو شیر کبھی صدمہ نہ پہنچائے گا
مگر انساں ہے کہ انسان کو کھا جائیگا

باز دل می برد م ذوقِ اسیری بلبل
گم ردم سوئے قفس خوردہ نگیری بلبل

مژدہ اے مرغ گرفتار کہ صیاد آمد
بانداز صیدِ فراموش خودش یاد آمد

چہ باک از قافیہ شد تنگ مارا ہمچو عیشِ من
قفس از نغمہ کے مانع شود مرغِ خوش الحاں را

ہمیں بھول جانے والے
ہمیں کیوں بھلا رکھا ہے

عشرتِ کو نکتی سے نہیں داقف پرویز
کہدو یہ لطف جو چاہے تو کہستان میں آ

ہم جو آنکھوں سے رواں سیل بہاراں کرتے
چشمۂ چشم سے شاداب گلستاں کرتے

ہم ہی مجبور ہوئے عشق میں حیراں ہوکر ورنہ اکثر انہیں غمناک پریشاں کرتے

میری تنہائی کی توہین نہ ہوتی یارب کوئی آنسو میری آنکھوں کا سہارا ہوتا

اس دل کی حسرتوں کا تو ماتم کرینگے ہم لیکن وہ خونفشانی چشم حزیں کہاں

نگاہوں میں مستی لبوں پہ تبسم بہار آرہی ہے کہ وہ آرہے ہیں

سنتے ہیں آپ نے کچھ ہم سے شکایت کی ہے آپ کی جان سے دور آپ سے فریاد نہیں

اے دل آ اپنے دل آزار کو پھر یاد کریں اس طرح روئیں کہ گلزار بھی فریاد کریں

مصرعے

لے کے آئی ہے جنوں فصل بہار اب کے برس

سچ پوچھو تو اب جینے کی فرصت ہی نہیں ہے

کیا ہوا میں نے اگر عشق کا اظہار کیا   آپ سے پیار کیا

کسی پہ بھی کسی حالت میں اعتبار نہ کر

ہم اپنی عید کو دل میں چھپائے بیٹھے ہیں

میں ہوں مبتلائے غم و محن، مرے ماہ رو مرے گلبدن

یہ حضرت ہیں مہمان بھلا کتنے دن کے

وہ فصلیں وہ بہاریں وہ گلستاں یاد آتے ہیں

اے ہجوم آرزو تو ہی بتا ہم کیا کریں

رخصت اے بزم جہاں

یہ ہے کون سرمست گفتار شیریں

تقاضہ ملتیں رہی ہے تدبیر دو رہی ہے

ہم ایسے ہیں کہ جیسے کسی کا خزانہ ہو

محبت ہے اختر اک آزاد شیریں

قبر کو میری مٹایا ہے غنیمت ہے بہت

باغباں کیسی خوشی آئی ہے اس گلشن میں

خواب رفتہ کو بہت یاد کیا ہے ہمدم

کس قدر آج پریشاں ہیں غیاض و اختر

بھٹکا کے جانے والو اے رہبرانِ بھٹکا!

مصرعہ جو موت سے چند لمحات پہلے ہونٹوں پر جاری تھا :-

ہوگئی بزمِ میکدہ خاموش

مرثیہ

محمد نظیر الدین خاں

محمد نظیر الدین ۔ ایف ایس ۔ سی علیگ جن کی شادی ۲۲ر اگست ۱۹۴۷ء کو اختر مرحوم کی دختر نیک اختر سے ہوئی تھی ۔ شادی کے تقریباً چالیس یوم بعد ۲۹ر ستمبر ۱۹۴۷ء کی صبح کو 'بناس' ندی کے کنارے قبلہ حافظ محمود صاحب شیرانی کے مزار پر فاتحہ کے لیے اپنی اہلیہ محترمہ اور دیگر متعلقین کے ساتھ گئے۔ فاتحہ خوانی سے فراغت کے بعد آپ اس ندی سے پانی لینے گئے۔ صاف پانی لینے کے خیال سے پانی میں کچھ دور اور

آگے قدم بڑھایا بدقسمتی سے پانی میں گڑھا تھا۔ پاؤں پھسلا اور ڈوب گئے۔
ادھر کنارے پر اخترؔ مرحوم کے صاحبزادے مظہر محمود خوشنود کھڑے تھے
جب کچھ دیر نظیر الدین پانی سے باہر نہ نکلے تو انہوں نے شور مچایا۔ اِدھر
اُدھر سے آدمی جمع ہو گئے اور لاش نکالی گئی۔ نظیر الدین ختم ہو چکے تھے۔
مذکورہ ذیل اشعار اخترؔ کے اسی احساس غم و الم کی یادگار ہیں :۔

ہے غرقِ ظلمتِ یاس آسماں آج
مہِ روشن ہے نظروں سے نہاں آج
خدائی بحرِ غم میں کیوں نہ ڈوبے
اجل ڈوبا نظیر الدین جواں آج
۱۳۲۲ھ